ڈاکٹر عبادت بریلوی
شجر ہائے سایہ دار
ادارہ ادب و تنقید لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

شجر ہائے سایہ دار

اِدارۂ ادب و تنقید ۔ لاہور

تصنیف : شجرہائے سایہ دار
مُصنف: پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر : فرحان عبادت ڈپٹی ڈائریکٹر
ادارۂ ادب و تنقید لاہور
سرورق: سید انور حسین شاہ نفیس رقم لاہور
مطبع : ندیم یونس پرنٹرز لاہور
کتابت: سید محمد ابراھیم خوش نویس لاہور
جلد سازی: مدنی بک بائینڈنگ ہاؤس لاہور
اہتمام طباعت: سید محمد ابراھیم لاہور
تاریخ اشاعت: ۱۹۹۱ء
تعاون: اکادمی ادبیات پاکستان - اسلام آباد
قیمت : -/۷۰ روپے

قائداعظم محمدؐ علی جناح
کی
یاد میں

عبادت بریلوی

فہرست

پیش لفظ

گذشتہ چند سال سے اِس عہد کی اہم تہذیبی اور ادبی شخصیات پر جو کام میں کر رہا ہوں "شجرہائے سایہ دار" اس سلسلے کی آٹھویں کتاب ہے۔

اِس سے قبل اس عظیم دور کی اہم شخصیات کے سات مجموعے (۱) رہ نوردانِ شوق (۲) آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صد رنگ (۴) یارانِ دیرینہ (۵) بلاکشانِ محبت (۶) غزالانِ رعنا اور (۷) آہوانِ صحرا شائع ہو چکے ہیں۔

ان سات کتابوں میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حضرت جگر مُراد آبادی، مولانا حسرت موہانی، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت نیاز فتح پوری، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر صوفی تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ، مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر عزیز احمد، میاں ام۔ اسلم، میاں بشیر احمد، پروفیسر سید وقار عظیم، پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی، مولانا نور الحسن خاں، ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر صابر علی خاں، پروفیسر سراج الدین، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا سید مرتضیٰ حسین، فاضل لکھنوی، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر خواجہ صلاح الدین، ناصر کاظمی، حبیب جالب، پروفیسر محمد حسن عسکری،

سید آغا حسن عابدی، پروفیسر سید نورالحسن، مرزا منان اللہ بیگ، پروفیسر مرزا محمود بیگ، ڈاکٹر خورشید احمد فارق، سید انعام الحق، پروفیسر سرسرل فلپس، پروفیسر رالف رسل، پروفیسر مارا ا ستیپانیس، پروفیسر سوخا چیف، پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر رانا احسان الہی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا حامد علی خاں، پروفیسر خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر سید ناظر حسن، ڈاکٹر عبیداللہ خاں، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، سید انور حسین شاہ نفیس الحسینی، پروفیسر ڈاکٹر طارق سومر، ڈاکٹر شوکت بولو، حکیم حافظ جلیل احمد وغیرہ کی شخصیات کے خاکے ہیں۔

"شجر ہائے سایہ دار" اس سلسلے کا آٹھواں مجموعہ ہے جس میں قائداعظم محمد علی جناح، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، جناب رفیع احمد قدوائی، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا محمد حسین، پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن کی ایسی عظیم شخصیات کے خاکے ہیں جو میرے رہبر و رہنما اور اُستاد تھے، جن کی شفقت اور محبت مجھ پر بے اندازہ تھی، اور جن سے میں نے زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

یہ خاکے اس اعتبار سے دلچسپ اور مُفید ہیں کہ ان سے نہ صرف ان عظیم انسانوں کی جیتی جاگتی تصویریں سامنے آتی ہیں بلکہ بیسویں صدی کے اس عظیم دور کے معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی، علمی اور ادبی ماحول کا نقشہ بھی اُبھر کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اور یہی ان خاکوں کو تحریر و تسوید اور طباعت و اشاعت کا بُنیادی مقصد ہے۔!

۲۵ مارچ ۱۹۹۱ء
لاہور

عبادت بریلوی

قائداعظم محمدؒ علی جناح

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسلم لیگ کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور قائداعظمؒ کے تدبر نے اس جماعت کو برعظیم ہندوپاکستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت اور اس کی تحریک کو مسلمانوں کی مسلمہ تحریک بنادیا تھا۔ مسلمانوں کے جوش اور جذبے کا یہ عالم تھا کہ وہ سوائے مسلم لیگ اور قائداعظم کے کسی اور جماعت، کسی اور نظریے اور کسی اور لیڈر کی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ میں اس زمانے میں طالب علم تھا۔ مسلمانوں کی سیاست سے مجھے گہری دلچسپی تھی۔ آپس میں گرماگرم بحثیں ہوتی تھیں۔ مختلف لوگ مختلف خیالات و نظریات پیش کرتے تھے۔ مختلف مسائل پر بے لاگ تبصرہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بات پر سب متفق تھے، وہ بات یہ تھی کہ مسلمانوں کو جس طرح قائداعظم نے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے، اور جس طرح وہ انگریز اور ہندو سیاست گری کو خوار کر رہے ہیں، اس میں وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

لکھنؤ اس زمانے میں ایک اہم سیاسی مرکز تھا۔ تمام سیاسی جماعتوں کے

رہنما لکھنو آتے، جلوس نکلتے، جلسے ہوتے۔ امین الدولہ پارک کے جلسوں سے اندازہ ہوجاتا تھا کہ کس سیاسی جماعت کی کتنی طاقت ہے اور کون سا لیڈر کتنا مقبول ہے۔ یہاں تقریباً روزانہ کوئی نہ کوئی جلسہ ہوتا تھا۔ اور مسلم لیگ کے جلسے تو نہایت اہتمام سے ہوتے تھے۔

قائداعظم اس زمانے میں کئی بار لکھنؤ تشریف لائے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ اس زمانے میں میں نے ان کی تقریر سنی یا نہیں۔ البتہ یہ مجھے بات یاد ہے کہ ۱۹۴۰ء میں غالباً مسلم لیگ کے لاہور سیشن سے قبل وہ لکھنؤ تشریف لائے تھے، اور مسلم لیگ کی طرف سے ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا تھا، جو گول دروازے سے شروع ہوکر وکٹوریا سٹریٹ اور نادان محل روڈ سے ہوتا ہوا امین الدولہ پارک میں ختم ہوا تھا، اور وہاں قائداعظم نے تقریر فرمائی تھی۔ یہ تقریر انگریزی میں تھی، لیکن اس کے باوجود لوگوں نے اس تقریر کو شوق سے سنا تھا، اور جوش اور جذبے سے لوگ بے حال ہوگئے تھے۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، اور قائداعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے فضا میں ایک لرزش سی پیدا کردی تھی۔ اس جلسے میں قرارداد لاہور کی باتیں ہوئی تھیں، اور قیام پاکستان پر بہت کچھ کہا گیا تھا۔ قائداعظم نے اس کی اہمیت واضح کی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قائداعظم سفید رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ ان کے چہرے پر رعب و جلال کی کیفیت تھی اور ان کی آواز میں گرج دار انداز اور ایک پرشکوہ اتار چڑھاؤ تھا جو بڑے سے بڑے پارلیمنٹیرین کو بھی ذرا مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔ اس تقریر میں قائداعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کو واضح کرکے اس وقت کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالی تھی اور مسلم لیگ کی تحریک کی اہمیت اور قیام پاکستان کی ضرورت پر نہایت خیال افروز باتیں کی تھیں۔ ہم سب ان کی اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے تھے، اور ان کی شخصیت کے نہایت گہرے نقوش

ہم لوگوں پر ثبت ہوئے تھے۔

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے لاہور سیشن میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کی قرارداد پاس کردی۔ اس کے بعد دلی اور لکھنؤ میں مجھے قائداعظم کی کئی تقریریں سننے کے مواقع ملے۔ ان تقریروں میں وہ ہمیشہ ہندوؤں کی سیاست، خصوصاً پراچین بھارت کو ایک دفعہ پھر زندہ کرنے کا ذکر ضرور فرماتے تھے اور اس پس منظر میں ہمیشہ واضح طور پر اس خیال کا اظہار کرتے تھے کہ برعظیم کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا قیام ضروری ہے، اور یہ کہ اب مسلم لیگ اس مطالبے سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوگی۔ قائداعظم کی ان تقریروں میں ایسا جادو ہوتا تھا کہ مخالفین کے سر پر چڑھ کر بولتا تھا۔ ہندو قوم کے افراد تک ان کی مدلل اور خیال انگیز باتوں کے قائل ہو جاتے تھے۔

میں ۱۹۴۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کرکے اردو کے استاد کی حیثیت سے اینگلو عربک کالج دہلی چلا گیا۔ اس زمانے میں قائداعظم اکثر اس کالج کو نوازتے تھے اور کالج کے طالب علموں کے سامنے تقریر فرماتے تھے۔ وہاں مجھے قائداعظم کو پہلی بار قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ اینگلو عربک کالج، دہلی میں مسلمانوں کا واحد کالج تھا اور ہندوستان میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بعد یہ کالج مسلمانوں کا ایک اہم تعلیمی ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ قائداعظم اس کالج کے سرپرست تھے اور نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب اس کے صدر تھے۔ یہ کالج دلی میں مسلم لیگ کا گڑھ تھا، اور لیگ کے اکثر جلسے اسی کالج میں ہوتے تھے۔ چنانچہ بے شمار جلسوں کے علاوہ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کا جو تاریخی کنونشن ہوا تھا، اس کے جلسے تین چار دن تک اسی کالج کے چمن میں ہوتے رہے تھے۔ اس کنونشن کا خاصا انتظام عربک کالج اور اسکول کے اساتذہ کے سپرد تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کالج میں کنونشن

کی وجہ سے چار پانچ دن کی چھٹی کردی گئی تھی تاکہ طالب علم اور اساتذہ کنونشن کے انتظامات کے لئے پورا وقت دے سکیں۔

اس کنونشن میں مجھے مسلم لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چوہدری خلیق الزمان، شیر بنگال مولوی فضل فضل الحق، حسین شہید سہروردی، جناب سعداللہ (آسام)، نواب بہادر یار جنگ، سرفیروز خان نون، خان عبدالقیوم خان، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، قاضی عیسٰے، سردار عبدالرب نشتر، سردار اورنگ زیب خان اور سب سے بڑھ کر قائداعظم محمد علی جناح کو میں نے اس زمانے میں نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ ان کی تقریریں سنیں اور مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ عربک کالج کے استاد ہونے کی حیثیت سے، اور پھر کنونشن کے انتظام میں شریک ہونے کی وجہ سے، ہم لوگوں کو خاصی مراعات حاصل تھیں۔ میں ان دنوں اینگلو عربک کالج ہی کے ایک حصے میں رہتا تھا۔ کنونشن میں شرکت کے لئے کچھ مہمان بھی میرے پاس لکھنؤ اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ میں نے کنونشن کے تمام اجلاسوں میں پوری طرح شرکت کی۔

قائداعظم نے اس کنونشن کی صدارت فرمائی تھی۔ ان کی شخصیت کی عظمت، ان کی ایک ایک بات سے ظاہر ہوتی تھی۔ تقریریں تو انہوں نے اس کنونشن کے کئی اجلاسوں میں کیں اور ان تقریروں کا وہی مخصوص انداز تھا جس سے قائداعظم کی شخصیت عبارت سمجھی جاتی تھی۔ مدلل اور واضح طور پر زوردار انداز میں بے باکی کے ساتھ بات کہنے کی بنیادی خصوصیات ان کے کنونشن کے خطبات اور تقریروں میں بھی نمایاں تھیں۔ لیکن جس طرح صدر کی حیثیت سے وہ ان جلسوں کو چلاتے تھے، میں نے اتنے رعب دار انداز میں، اس قدر باقاعدگی کے ساتھ کسی اور لیڈر کو اس طرح جلسوں کو چلاتے ہوئے

نہیں دیکھا۔
ایسے جلسوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب قرار دادیں پیش کی جاتی ہیں تو مختلف تقریروں کی وجہ سے تھوڑا سا انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایسے مواقع پر قائدِ اعظم اپنے مخصوص انداز میں دو لفظ منہ سے نکالتے تھے۔
"آرڈر، آرڈر۔"
اور سارے مجمع پر ایک ایسی خاموشی چھا جاتی تھی جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہیں۔
یہ دو الفاظ آج بھی میرے ذہن میں گونجتے ہیں اور قائدِ اعظم کی زبان سے وہ جس طرح نکلتے تھے، میں انہیں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کے ان الفاظ نے حاضرین پر جامد سا کر دیا ہے اور وہ ساکت و صامت ہو گئے ہیں۔
مجھے کنونشن کی وہ آخری رات آج بھی نہیں بھولتی، جب میں دن بھر اجلاسوں میں شرکت کر کے، اور کام کر کر کے تھک گیا تھا، اور تھکن سے چور ہو کر اپنے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔ بارہ بجے رات کے قریب میری آنکھ کھلی۔ ایک صاحب کسی قرار داد پر دھواں دھار تقریر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم خون کے دریا بہا دیں گے۔ ہماری تلواریں میان میں نہیں رہیں گی۔ سروں پر چمکیں گی اور چنگیز و ہلاکو کی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔
میں یہ جذباتی سی تقریر سن کر سوتے سے اٹھ بیٹھا تھا، اور یہ سوچ رہا تھا کہ واقعی کوئی قیامت آنے والی ہے۔ اور واقعی خون کے دریا بہنے والے ہیں کہ اس کے فوراً بعد قائدِ اعظم نے اپنی اختتامی تقریر شروع کی۔ جس میں اس طرح کے جذباتی انداز پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس بات کی وضاحت

کہ ہوش و خرد کا دامن کسی حال میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ خون بہانے، تباہ و برباد کرنے، کسی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے اور چنگیز و ہلاکو کی یاد تازہ کر دینے سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہر کام ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ نظم و ضبط ہر کام کے لئے ضروری ہے۔ یہ نظم و ضبط یقین محکم سے پیدا ہوتا ہے۔ عزم وارادہ انسان کے بہترین رفیق ہیں اور دنیا کے تمام اہم کارنامے تاریخ میں اسی کے ہاتھوں انجام پائے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں، اور انہیں کو مشعل راہ بنا کر آگے بڑھنا ہمارا نصب العین ہے۔ ہر مسلمان اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔ وہ خدا سے ڈرتا ہے۔ انسانوں کا احترام کرتا ہے اور زندگی کو بہتر بناتا ہے۔ برعظیم کے مسلمان بھی اسی مسلک پر گامزن رہیں گے اور اپنے وطن میں ایسا نظام قائم کریں گے جس میں انسانی قدروں کو فروغ حاصل ہوگا۔ ہر شخص کو وہاں آزادی ہوگی۔ وہاں جمہوری نظام ہوگا۔ عوام کی حکومت ہوگی، اور انسانیت کا بول بالا ہوگا۔

اور قائداعظم کی یہ تقریر سن کر میری پریشانی دور ہو گئی تھی، اور مجھے ایک ایسی طمانیت کا احساس ہوا تھا جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اس موقع پر اینگلو عربک کالج کے طلباء کی طرف سے قائداعظم کے اعزاز میں عشائیہ بھی دیا گیا تھا۔ میں بھی اس میں مدعو تھا، اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کے قریب بیٹھا تھا۔ قائداعظم مولوی صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ دورانِ گفتگو اُنھوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ اُنھوں نے اپنی پہلی اُردو تقریر سلہٹ میں کی تھی سر عزیزالحق اُن کے ساتھ تھے۔ اُن کا اصرار تھا کہ قائداعظم انگریزی میں تقریر کریں۔ لیکن اُنھوں نے اپنی تقریر اُردو میں کی جس کو حاضرین نے پسند کیا لیکن قائداعظم نے فرمایا کہ اُن کی اُردو تانگے والے کی اُردو ہے۔ ابھی اس میں وہ بات نہیں ہے جو ہونی چاہیئے۔

اس کنونشن کے سلسلے کی آخری تقریب ایک کل ہند مشاعرہ تھا جس کو قائداعظم اور قائد ملت کے ایما پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اور جس کی تمام تر ذمہ داری اس خاکسار کے کمزور شانوں پر تھی۔ اس مشاعرے میں تقریباً ایک لاکھ کے قریب سامعین شریک ہوئے تھے، اور اس کی صدارت میری اس درخواست پر کہ یہ مسلم لیگ کی کنونشن کی آخری تقریب ہے، اور اس کو قائداعظم اور قائد ملت کے ایماء پر ترتیب دیا گیا ہے، بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب صدر انجمن ترقی اُردو نے قبول فرمائی تھی۔ اس مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ قائداعظم اور ان کے کارناموں کے بارے میں شعرائے کرام نے خصوصی نظمیں پڑھی تھیں اور اس مشاعرے میں حضرت جگر مراد آبادی، مولانا حسرت موہانی، حضرت جوش ملیح آبادی، مجاز، جاں نثار اختر، جذبی وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ اور قائداعظم نے اس مشاعرے کو اپنے خصوصی پیغام سے نوازا تھا۔ اس مشاعرے میں ایک شاعر کرار نوری بھی شریک ہوئے تھے جنہوں نے قائداعظم کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ حاضرین بار بار اس قصیدے کو پڑھنے کی فرمائش کرتے تھے، اور اُن کی یہ فرمائش پوری کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ اس مشاعرے میں کئی بار یہ قصیدہ پڑھا گیا، اور کرار نوری صاحب نے یہ قصیدہ پڑھ کر مشاعرے کو لوٹ لیا۔

قائداعظم کو میں نے آخری بار جامع مسجد دہلی کے ایک جلسے میں دیکھا۔ یہ جلسہ جامع مسجد کے سامنے اُردو بازار کے کُھلے میدان میں ہوا تھا، اور اس موقع پر قائداعظم نے اُردو زبان میں تقریر فرمائی تھی۔ یہ جلسہ مسلم لیگ کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا۔ جامع مسجد کے سامنے ہزار ہا مسلمان جمع تھے۔ قائداعظم اس جلسے میں تشریف لائے۔ وہ اس وقت شلوار اور شیروانی میں ملبوس تھے اور جناح کیپ پہنے ہوتے تھے۔ تلاوتِ کلام پاک کے

بعد انہوں نے تقریر شروع کی۔ میری حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی، جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ اُردو میں تقریر فرما رہے ہیں۔ اس وقت لارڈ پیتھک لارنس کی سربراہی میں کیبنٹ مشن آیا ہوا تھا، اور قائداعظم کی یہ تقریر اسی سے متعلق تھی۔ وہ مسلمانوں کو براہ راست یہ بتانا چاہتے تھے کہ اب تک کیا کچھ ہو چکا ہے اور آئندہ جو مذاکرات ہوں گے، ان میں وہ کیا پوزیشن اختیار کریں گے۔ یہ قائداعظم کی بڑی ہی اہم پبلک تقریر تھی۔ اس تقریر میں اعتماد کی جو لہر دوڑی ہوئی تھی اور برعظیم کے مسلمانوں کی جدوجہد اور قیام پاکستان کے متعلق انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ نہایت فکرانگیز تھے، قائداعظم کے یہ فقرے آج بھی نہ صرف میرے کانوں میں بلکہ میری روح میں گونجتے ہوئے ہیں۔

"اور اب ایک کیبنٹ مشن آیا ہوا ہے، ہم اسے بھی سنبھال لیں گے"۔
"مسلمان کسی سے دب کر نہیں رہ سکتے۔ وہ پاکستان حاصل کر کے رہیں گے"۔

"پاکستان کا قیام ہمارا نصب العین ہے۔ یہ ہماری منزل ہے۔ ہم انشاءاللہ اس منزل سے ضرور ہم کنار ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہم کسی اور تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں"۔

"مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بعض مسلمان آج کل گمراہ ہو رہے ہیں اور ان کو گمراہ کرنے کی سیاسی کوششیں تیز کر دی گئی ہیں۔ لیکن یہ جاہل مسلمان، یہ غدار مسلمان، یہ نادان مسلمان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے"۔ پاکستان انشاءاللہ بن کر رہے گا۔ ہندوستان کی تقسیم ہو کر رہے گی۔ سوائے اس کے ہندوستان کا کوئی اور آئینی حل نہیں ہے"۔

"ہمارا قافلہ منزل کی طرف رواں دواں رہے گا اور ہم اس منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ انشاءاللہ!"

میں اس جلسے میں سب سے پہلے پہنچا تھا، اور مجھے سب سے آگے بیٹھنے کا موقع مل گیا تھا اور بہت قریب سے تقریباً ایک گھنٹے تک قائداعظم کو دیکھنے اور اردو زبان میں ان کی تقریر سننے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی تھی۔ اور پھر صرف چند ماہ بعد پاکستان کا خواب حقیقت بن گیا تھا۔ یہ خواب جو سب سے پہلے علامہ اقبال نے دیکھا تھا قائداعظم کی عظیم قیادت نے اس خواب کو عملی شکل دے دی تھی۔ قیام پاکستان کا جب اعلان ہوا تو ہندوستان کے مختلف اخباروں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں یہ خبر چھاپی لیکن مسلم لیگ کے اخبار "ڈان" کی اس پہلے صفحے کی شہ سرخی "پاکستان زندہ باد" کو میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا، اور اس کو دیکھ کر حیرت اور مسرت کی جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی تھی وہ کبھی بھی بھلائی نہیں جا سکتی۔

قائداعظم کی عظیم قیادت نے پاکستان بنا دیا تھا، اور دُنیا کے نقشے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی اسلامی مملکت یعنی مملکت پاکستان کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ساری دنیا اس پر ششدر اور حیران تھی۔ لیکن یہ تاریخ کا ایسا اہم واقعہ تھا کہ دنیا کی تمام حکومتیں اس نئے ملک اور نئی حکومت کو تسلیم کرنے اور اس کو خراج تحسین پیش کرنے میں پیش پیش تھیں۔ دُنیا نے ہمیں ایک قوم، ایک مُلک، اور ایک تہذیب کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا۔

اور یہ سب کچھ قائداعظم کی عظیم شخصیت کا عظیم کارنامہ تھا۔

قیام پاکستان کے بعد دِلّی اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں بڑے پیمانے پر ایسے فسادات ہوئے جو چشم فلک نے اس سے قبل کبھی دیکھے نہیں تھے۔ لاکھوں قتل ہوئے کروڑوں بے گھر ہو گئے۔ میں بھی رفیوجی ہو گیا۔ دِلّی کے پُرانے قلعے میں پناہ لی۔ وہاں میدان حشر کا منظر دیکھا۔ بڑا روح کش ماحول تھا۔ کئی دن تک لوگ بھوکے پیاسے رہے۔ قائداعظم کی بصیرت یہاں بھی کام آئی۔ انہوں نے حکومت پاکستان کے ملازموں کو

کراچی لے جانے کے لئے پی-او-اے سی کے جہاز چارٹر کئے تھے۔ وہ جب کراچی سے واپس آتے تھے تو اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لے آتے، جن کو بلوچ رجمنٹ کے ٹرک پرانے قلعے میں پہنچا دیتے تھے۔ اس کھانے سے بہت سے لوگوں کی جان بچی۔ لاکھوں مسلمانوں کی بھوک تو اس سے کیا ختم ہوتی۔ لیکن بہرحال اس سے سہارا ضرور ملا۔

یہ بھی قائداعظم کی بصیرت اور عوام سے ان کی محبت کا ایک کارنامہ تھا۔ ورنہ اس حشر کے میدان میں کون کس کا خیال کرتا تھا۔ نفسا نفسی کی کیفیت تھی کہ خدا کی پناہ!

قیام پاکستان کے فوراً بعد کا زمانہ قائداعظم کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا ہر طرف سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ لیکن قائداعظم نے اپنی بصیرت اور محبت سے ان سازشوں کو خاک میں ملا دیا، اور ایک ملک، ایک قوم، ایک معاشرے اور ایک تہذیب کی ایسی تعمیر کی، اور عوام میں ایک ایسا جوش اور جذبہ پیدا کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

میں اس زمانے میں اکثر یہ سوچتا تھا کہ قائداعظم کی بصیرت آہنی عزم و ارادے اور جذب و جنوں نے تعمیر ملت کے لئے جو کچھ کیا وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے حد درجہ ناسازگار حالات میں ایک ملک بنایا، ایک قوم کی تعمیر کی، ایک نئے معاشرے اور ایک نئی تہذیب کا سنگ بنیاد رکھا۔

اور اس کی بدولت نہ صرف برعظیم پاکستان و ہند اور عالم اسلام کا نقشہ بدلا بلکہ ساری دُنیا میں سیاسی، معاشرتی تہذیبی اور فکری اعتبار سے ایک ایسی تبدیلی رونما ہوئی جس کو ایک معجزہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اسلامیانِ پاکستان و ہند کے اہم رہنما، تحریک پاکستان کے ایک سربرآوردہ لیڈر اور قائدِ اعظم کے ایک اہم رفیق کار تھے۔ اُنھوں نے زندگی بھر اُردو کی خدمت کی، اور اس زبان کے فروغ کے لئے کام کیا۔ سیاسی سطح پر مسلمانوں کے لئے جو کام قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کیا، ثقافتی سطح پر وہ کام بابائے اُردو نے کیا۔ اسی کام میں اُنہیں قائدِ اعظم کی قیادت اور رفاقت کا شرف حاصل تھا، اور یہ سب کچھ اُنہیں کی کوششوں کا ثمر ہے کہ آج اُردو، اسلامی جمہوریۂ پاکستان کی قومی زبان ہے، اور اس زبان میں اعلیٰ پائے کا علمی ادبی کام ہو رہا ہے۔

اُردو کو فروغ دینے اور ترقی سے ہم کنار کرنے کا آغاز مولوی صاحب سرسید احمد خاں کی نگرانی میں علی گڑھ سے کیا۔ سرسید اس اعتبار سے اُن کے معنوی اُستاد اور ذہنی رہنما تھے۔ سرسید نے اُردو کی ترقی کے لئے جو خواب دیکھے تھے، اور جو بے شمار منصوبے بنائے اس کو عملی شکل مولوی صاحب ہی نے دی۔ اُردو کی خِدمت کا جذبہ اُنہیں کشاں کشاں حیدر آباد دکن لے گیا، جہاں

کی سرکاری زبان اُردو تھی، اور جہاں اُردو کے لئے کام کرنے کے مواقع شمالی ہندوستان کے مقابلے میں نسبتاً بہت زیادہ تھے۔ حیدرآباد میں اُنہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہاں اُن کی کوششوں سے دارالترجمہ قائم ہوا، جس میں علمی کام کرنے کی غرض سے انہوں نے ہندوستان کے کونے کونے سے عالموں اور ادیبوں کو بُلا کر حیدرآباد میں جمع کیا، اور جن کی نگرانی میں ہزارہا علمی کتابوں کے اُردو ترجمے ہوئے۔ اِن ترجموں کی بدولت اُردو کے دامن میں وسعتیں پیدا ہوئیں، اور اُس نے قلیل عرصے میں ایک علمی زبان کی حیثیت سے ہندوستان میں ایک نمایاں مقام پیدا کرلیا۔ اور یہ سب کچھ مولوی صاحب کا ایک اہم کارنامہ تھا۔

عثمانیہ یونیورسٹی جب قائم ہوئی تو اس میں مولوی صاحب اُردو زبان و ادب کے پہلے پروفیسر مقرر کئے گئے، اور انہوں نے پروفیسر اور شعبۂ اُردو کے صدر کی حیثیت سے ایسے کارنامے انجام دیئے جو اسلامیانِ ہند کی تہذیبی تاریخ میں سُنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے پہلے پروفیسر اور انجمن ترقیٔ اُردو کے سکریٹری کی حیثیت سے اُنہوں نے علمی ادبی کام کیا، تلاش و جستجو کی محنت شاقہ کے بعد اُردو فارسی کے ہزارہا نادر و نایاب قلمی اور مطبوعہ نسخے جمع کئے، اُردو ادب پر اہم کتابیں شائع کیں، قدیم اُردو ادب کے نوادر پر ترتیب و تدوین کا قابل قدر کام کیا جس کی بدولت اس زبان و ادب پر بے شمار اہم کتابیں چھپ کر سامنے آئیں، علمی اصطلاحات کو وضع کرنے کا بھی کام کیا جس کی وجہ سے یہ زبان علمی اعتبار سے وسعتوں سے ہم کنار ہوئی، اور نوجوان ادیبوں اور علمی کام کرنے والوں کی ایسی کھیپ پیدا کی جنہوں نے اپنی زندگیاں علمی ادبی کام کے لئے وقف کردیں، اور اُنہوں نے اُردو زبان و ادب پر نہایت قابل قدر کام کیا۔ اِن میں مولانا وحیدالدین سلیم، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبداللہ عمادی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مولانا

مولانا سید ابوالخیر مودودی، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر سید محیٰ الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، شیخ چاند، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر عبداللطیف، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر عزیز احمد وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان میں سے بعضوں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفے دے کر اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونِ ملک بھی بھیجا، جہاں سے وہ نہ صرف ڈگریاں لے کر وطن واپس آئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے بلکہ انہوں نے اعلیٰ پائے کا علمی کام بھی کیا۔

مولوی صاحب نوجوانوں کے معاملات میں ہمیشہ گہری دلچسپی لیتے تھے۔ انہیں ہمیشہ جوہر قابل کی تلاش رہتی تھی۔ اور وہ اُن کی ہمیشہ مدد کرتے تھے۔ کوئی معمولی سا طالب علم بھی اگر انہیں خط لکھتا تھا، اور زبان وادب کے مطالعے کے سلسلے میں اُن سے مشورہ طلب کرتا تھا، تو وہ فوراً اُس کا جواب لکھتے تھے، اور اس کو اپنے نہایت مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔ خود میرا اُن سے رابطہ اسی طرح قائم ہوا۔

اُردو میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد میرے دل میں اُردو ادب کے بعض موضوعات پر تحقیق کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ میں نے خط لکھ کر اُن سے مشورہ کیا۔ بغیر کسی تاخیر کے مولوی صاحب کا جواب آیا جس میں لکھا تھا:۔

۱۔ دریا گنج، دہلی
۱۱ر جولائی ۱۹۴۲ء

مکرمی سلمہٗ

آپ کا خط پہنچا۔ آپ نے بہت اچھے موضوع سوچے تھے۔ تعجب ہے آپ کے اساتذہ نے منظور نہیں کئے بہرحال دوسرے

موضوع بھی بہت خوب ہیں۔ اور اُن پر تحقیق کا بہت اچھا کام ہو سکتا ہے۔ اِنشا مجھے بھی پسند نہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ کو اپنے پروفیسروں کی نگرانی میں کام کرنا ہے، اور اُن کے مشورے کے خلاف کوئی موضوع انتخاب کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اگر وہ میر تقی میر یا تنقید والے موضوع کو پسند کرلیں تو اُس پر دل لگا کر کام کیجئے۔ اگر مجبوری ہو اور وہ کسی طرح رضامند نہ ہوں تو پھر اِنشا ہی سہی۔ علاوہ شاعر کے اُس کی دوسری حیثیت بھی تو ہے۔

خیر طالب عبدالحق

مولوی صاحب کے اس خط نے میرے اندر ہمت پیدا کی اور میں نے تنقید پر کام شروع کردیا اور چند سال میں اُردو تنقید کا ارتقا کے موضوع پر کام کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس تحقیقی کام کے دوران مجھے مولوی صاحب کا تعاون حاصل رہا۔ انہوں نے ہمیشہ میری مدد کی، اور جب مقالہ مکمل ہوگیا تو مولوی صاحب نے اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ انجمن ترقیٔ اُردو کی طرف سے شائع بھی کردیا۔ انہوں نے اس کتاب پر مقدمہ بھی تحریر فرمایا جس میں میرے کام کی تعریف کی۔ اُن کی شفقت اور محبت مجھے نصیب نہ ہوتی تو یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔

ام۔ اے اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد میں تلاش معاش میں سرگرداں رہا۔ میری خواہش تھی کہ مجھے لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کی لکچرشپ مل جائے تاکہ میں لکھنؤ میں رہ کر اطمینان سے علمی کام کرسکوں۔ لیکن مجھے اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ مولوی صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے اینگلو عربک کالج دہلی یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرار کی حیثیت سے میرا تقرر کروالیا، اور میں نے دلی میں رہ کر اُن کی نگرانی میں تدریس و تحقیق کا کام کیا۔ مولوی صاحب اُس زمانے میں دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے اعزازی صدر تھے۔

میں نے اُن کے زیرِ سایہ کام کیا۔ اُن کی شفقت اور محبت نے مجھے ہمیشہ حاصل رہی۔ اُنہوں نے انجمن ترقی اُردو کی لائبریری کے دروازے بھی میرے لئے کھول دیئے جس کی وجہ سے مجھے علمی ادبی کام کرنے کے مواقع ملے۔ چنانچہ میں نے اپنے پسندیدہ موضوعات پر کئی کتابیں طباعت و اشاعت کے لئے تیار کرلیں۔ ان میں غزل اور مطالعۂ غزل اور روایت کی اہمیت مولوی صاحب نے انجمن کی طرف سے شائع کیں، اور مجھے محقق، نقاد اور ادیب بنا دیا۔

غزل پر میرے کام کو مولوی صاحب نے بہت پسند کیا، اور اس پر جو رائے لکھی، اُس میں اُن کی شفقت اور محبت کو دخل تھا۔ ورنہ میں اس قابل نہیں تھا۔ مولوی صاحب نے اس کتاب پر یہ فقرے تحریر فرمائے تھے۔

حالی کے بعد کچھ دنوں غزل پر بہت لے دے رہی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بعض فرسودہ رسم و رواج کی طرح یہ صنف کلام متروک ہو جائے گی۔ لیکن یہ ہماری تہذیب، ہماری روایات، ہمارے خیالات و تصورات میں ایسی رچی ہوئی تھی کہ اس کا ترک ہمارے اختیار سے باہر تھا۔ حالی اصلاح چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اس میں وسعت پیدا کی۔ پھر اس کی وسعت کا دائرہ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اس نے وقت کے تقاضوں اور ماحول کے اثرات کو اپنے میں ایسا جذب کیا کہ اُس کے حُسن و جمال میں ایسی دلکشی اور رعنائی پیدا ہو گئی کہ وہ تمام اصناف سخن پر چھا گئی، اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ عالم و عامی، پڑھے لکھے، اور ان پڑھ سب اس کے شیدائی ہیں۔ یہ بہت نازک صنف ہے۔ اُس کی اپنی زبان ہے، اور حُسن بیان اُس کی جان ہے۔

اس کتاب کا موضوع غزل ہے۔ ڈاکٹر عبادت نے غزل کے ارتقا، اس کی اہمیت، اُس کے جمالیاتی پہلو، جدید رُجحانات اور

اس کے مستقبل، غرض اُس کے ہر پہلو پر بہت تفصیلی اور بصیرت افروز بحث کی ہے، اور غزل سے متعلق تمام مسائل کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ چند مضامین غزل کے اصول کی تنقید میں ہیں اور چند غزل کے ارتقا پر۔ غزل پر ایسی جامع کتاب، جس میں غزل پر اس تفصیل سے بحث کی گئی ہو اب تک نہیں لکھی گئی۔

ڈاکٹر عبادت صاحب اُردو کے ممتاز نقادوں میں ہیں، اور اُن کا انداز تنقید امتیازی حیثیت رکھتا ہے"۔

یہ کتاب اور مولوی صاحب کی یہ تحریر اب نایاب ہے۔ اس لئے میں نے محفوظ کرنے کے خیال سے اس کو یہاں نقل کر دیا ہے۔ اس کا مقصد خود ستائی نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ مولوی صاحب نوجوان لکھنے والوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے تھے، اور اس خیال سے اُن کی تعریف کر دیتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علمی ادبی کام کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اسی خیال کے پیش نظر نوجوان ادیبوں اور طالب علموں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی، اور اُن کی اس حوصلہ افزائی کی وجہ سے نئی نسل کے ادیبوں کی ایک ایسی کھیپ پیدا ہوئی جس نے اُردو ادب کے دامن کو وسیع کیا، اور اس میں نئے نئے گل بوٹے کھلائے۔ مولوی صاحب کی بصیرت اسی بات کی خواہش مند تھی۔ وہ اُردو ادب کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔

یہی خواہش تھی جس نے مولوی صاحب کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ وہ اس میں شریک ہوئے، صدارت بھی کی، خطبہ بھی پڑھا، اور ان ادیبوں کی تحریروں اور اُن کے مشن کو سراہا۔ چنانچہ اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ انہوں نے ساری زندگی اس

تحریک اور اس کے علم برداروں سے دلچسپی لی، اور ہمیشہ انہیں سراہا۔
دلی کے دوران قیام میں میرا یہ معمول تھا کہ میں شام کو ہر روز مولوی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ ایک دن میں اُن کی جائے قیام پر نہرا۔ دریا گنج پہنچا تو مولوی صاحب نے مجھے ایک دعوت نامہ دکھایا جس میں یہ اطلاع تھی کہ مُراد آباد میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس ہو رہی ہے، اس کی صدارت فرمایئے۔

مولوی صاحب نے یہ دعوت نامہ دکھا کر دریافت کیا "یہ کانفرنس کون لوگ کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ترقی پسند ادیب یہ کانفرنس کر رہے ہیں، اور جہاں تک مجھے علم ہے اس میں چوٹی کے ترقی پسند ادیب حصہ لیں گے۔ آپ اس کی صدارت ضرور قبول فرمایئے"۔

مولوی صاحب نے کہا "میں نوجوان لکھنے والوں کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ ان کی تحریروں میں مجھے بڑی جان نظر آتی ہے۔ یہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ اس لئے میں اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوں گا"۔

چنانچہ مولوی صاحب اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مُراد آباد گئے، اور اس میں شریک ہو کر اور ترقی پسند ادیبوں کی کارکردگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

غرض مولوی صاحب نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے، اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اُن کی کانفرنسوں اور محفلوں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ اُن کی تحریروں کو انجمن کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع بھی کرتے تھے۔ اُن میں قدیم اور جدید کا تعصب نام کو نہیں تھا۔ وہ نئے ادیبوں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی کہ قدیم لکھنے والوں کو۔ اُنھوں نے بعض نئے لکھنے والوں کو انجمن کے ساتھ منسلک بھی کر لیا تھا

اور وہ مولوی صاحب کی رہنمائی میں انجمن کے لئے تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔ ان لکھنے والوں میں مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی، شیخ چاند، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، حکیم اسرار احمد کریوی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر عزیز احمدؒ، حیات اللہ انصاری، طفیل احمدؒ خاں اور رفیق الدین احمدؒ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان لکھنے والوں نے مولوی صاحب کی رہنمائی میں قابل قدر علمی ادبی کام کیا، اور ان کی تصانیف بڑے اہتمام کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کی گئیں۔

مجھ پر بھی مولوی صاحب نے ہمیشہ شفقت فرمائی، اور اُن کی اس شفقت کی بدولت مجھے بھی اُن کی نگرانی میں کام کرنے کے مواقع ملے۔ انہوں نے اُس زمانے میں مجھے ملازمت دلوائی جب مسلمان کے لئے ملازمت کا ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ یہ مولوی صاحب کی شفقت اور محبت ہی تھی کہ مجھے اینگلو عربک کالج دہلی میں بغیر درخواست دیئے ہوئے اُردو کی لکچر شپ اور شعبۂ اُردو کی صدارت ملی، اور مجھے اُن کی رہنمائی میں تدریس و تحقیق میں کام کرنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ یہ اُن کا کرم تھا کہ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے مجھے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں بہ حیثیت سینئر لکچرار، ریڈر، اور پروفیسر کام کرنے کے مواقع ملے، اور اس عظیم ادارے کے ساتھ منسلک ہو کر میں نے علمی ادبی کام کیا۔ یہ اُن کی نوازش ہی تھی جس کی وجہ سے میری کئی کتابیں انجمن ترقیٔ اُردو سے شائع ہوئیں۔ میں اُن کی ان نوازشات اور اُن کی شفقت اور محبت کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

دِلّی کے دورانِ قیام میں میری تجویز پر مولوی صاحب نے ازراہ نوازش اعزازی طور پر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی صدارت قبول کی، اور یہ صرف نام کی صدارت نہیں تھی۔ مولوی صاحب ام۔ اے اور بی۔ اے آنرز کے طالب علموں کو ہفتے میں کم از کم پانچ لکچر ضرور دیتے تھے، اور ساتھ ہی تحقیق

کے سلسلے میں پی ایچ ڈی کے اسکالرز کی رہنمائی بھی فرماتے تھے۔

اُس زمانے میں میں دہلی یونیورسٹی اور اینگلو عربک کالج میں اُردو زبان وادب کا واحد اُستاد تھا۔ مولوی صاحب کے لیکچر دینے کی وجہ سے میرا کچھ کام ہلکا ضرور ہوگیا تھا لیکن پھر بھی پڑھانے کا کام خاصا تھا۔ اس لئے میں نے یونیورسٹی اور کالج کو یہ تجویز پیش کی کہ شعبۂ اُردو میں ایک لیکچرار کا مزید تقرر کیا جائے۔ اصولی طور پر میری یہ تجویز منظور تو کرلی گئی لیکن فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے لیکچرار کے تقرر کا معاملہ، خاصے عرصے تک، کھٹائی میں پڑا۔

جب میں نے بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی توجہ اس صورتِ حال کی طرف مبذول کروائی تو اُنھوں نے فرمایا کہ "لیکچرار کا تقرر کرلو۔ اس کی تنخواہ میں دوں گا"۔ چنانچہ میں نے اس جگہ پر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا تقرر کرلیا، اُن کی تنخواہ مولوی صاحب دیتے رہے۔ کئی سال کے بعد یونیورسٹی اور کالج کے اربابِ اختیار اپنے بجٹ میں سے اُردو کے لیکچرار کی تنخواہ دینی شروع کی، اور اس طرح شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہوا۔

مولوی صاحب اگر اس لیکچرار کی تنخواہ کا بوجھ ذاتی طور پر نہ اُٹھاتے تو اُردو کا ایک مزید لیکچرار مجھے کبھی بھی نہ ملتا، اور شعبۂ اُردو میں تدریس و تحقیق کا کام خاطر خواہ نہ ہو پاتا۔

قیام پاکستان کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بھی مولوی صاحب نے شعبۂ اُردو کے قیام میں بڑی مدد کی۔ اُردو کے استادوں کی کئی آسامیاں اورینٹل کالج میں منظور کروائیں۔ اور اُن پر اُردو کے نامور اساتذہ کا تقرر کروایا۔ اِن میں پروفیسر طاہر فاروقی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کے نام سرفہرست ہیں۔

تحقیق کے کاموں میں بھی مدد کی، طالب علموں کو وظائف بھی دیئے،

اور امتحانات میں اچھے نتائج دکھانے والے طالب علموں کو تمغے دینے کے منصوبے بھی بنائے، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

طالب علموں اور اُستادوں کی مدد کرنے میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کا جواب نہیں تھا، اور اس میں تعلیم سے اُن کی دلچسپی اور علم وادب سے غیر معمولی شغف کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

قیام پاکستان کے بعد مولوی صاحب دلی کو چھوڑ کر کراچی تشریف لے آئے اور نشار دا منڈر کراچی کی عمارت میں انجمن ترقیٔ اُردو کا دفتر قائم کر کے اُردو کا کام شروع کر دیا۔ یہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اُردو کے پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت ملی، اور اُردو میں ہر سطح پر کام کرنے کا ماحول پیدا ہوا۔ اُردو زبان کے بارے میں قائداعظم کے جو منصوبے تھے، اُن کو مولوی صاحب نے عملی جامہ پہنایا، اور باوجود ناسازگار حالات کے اُردو کو اُس کا جائز مقام دلایا اور جس کی بدولت اُردو نے ترقی کی بے شمار منزلیں طے کیں۔ میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب کی کوششوں سے اُردو کو پاکستان میں پناہ نہ ملتی تو اس زبان کا کیا حشر ہوتا۔ ہندوستان سے تو اُردو کو دیس نکالا مل ہی گیا تھا۔ پاکستان میں یہ کسی صوبے کی زبان نہیں تھی۔ پھر بھی مولوی صاحب نے پاکستان کے ہر علاقے میں اِس کے وجود کو تسلیم کروایا، اور ان علاقوں کے رہنے والے اس زبان کو بولنے اور اس سے کام چلانے میں پیش پیش نظر آئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام کی چھاپ اس زبان پر بہت گہری تھی، اور چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا۔ اس لئے اس وطن عزیز میں لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور قومی زبان کی حیثیت سے اس کو تسلیم کر کے اس زبان میں اہم کارنامے انجام دیئے۔

مولوی صاحب کی یہ کوشش تھی کہ آزادی کے بعد وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ اُردو کا کام کریں لیکن ہندوستان کے ارباب اختیار نے اس کو پسند

نہیں کیا۔ انہوں نے انجمن ترقیٔ اُردو کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے کتب خانے کو برباد کر دیا۔ اُس کے علمی کاموں کو نیست و نابود کر دیا۔ بڑی مشکل سے مولوی صاحب اپنی اہم کتابوں کے صندوق خفیہ طور پر پاکستان لانے میں کامیاب ہوئے۔ اُن کے رفیق کار علی شبّیر حاتی نے اس سلسلے میں اُن کی جو مدد کی، اور جس طرح وہ اس دولت بیش بہا کو پاکستان لائے، وہ ہماری قومی تاریخ میں سُنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

پاکستان میں مولوی صاحب نے بہت بڑی تعداد میں علمی ادبی کتابیں شائع کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر علاقے میں اُردو کانفرنسیں کیں جن کی وجہ سے اُردو کے ساتھ عوام کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ کام کرنے کے بے شمار منصوبے بنائے۔ مختلف حکومتوں نے اس کام میں مدد کی اور فروغ اُردو کے مختلف منصوبوں کو پروان چڑھانے میں کروڑوں اربوں روپے صرف کیے۔ جس کی بدولت یہ زبان پاکستان کی سب سے اہم زبان بن گئی، اور اس میں تعلیمی، علمی اور دفتری سطح پر کام کرنے کی ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئیں جو اس ملک کی کسی دوسری زبان میں نہیں تھیں۔ اسی وجہ سے اُردو کو پاکستان کی قومی زبان بنایا گیا، تعلیم بھی اس زبان میں ہونے لگی۔ اور دفتری کام بھی اس زبان میں ہونے لگا۔ اُردو کو ان منزلوں سے ہم کنار کرنے میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی کوششوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصے بعد مولوی صاحب نے کراچی میں اُردو کالج اور اُردو سائنس کالج قائم کیے، جن میں اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم اُردو زبان میں دی جاتی تھی۔ دراصل مولوی صاحب پاکستان میں اُردو یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے، اور ان کالجوں کو قائم کر کے اور اُن کو فعال بنا کے اُنہوں نے اُردو یونیورسٹی کا سنگ بُنیاد رکھ دیا تھا۔ افسوس ہے کہ بعض ناسازگار حالات کی وجہ سے یہ منصوبہ تکمیل سے ہم کنار نہ ہو سکا۔ کالج تو اب بھی قائم ہیں، اور اپنا

کام جذب و شوق کے ساتھ انجام دے رہے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی تک انہیں اُردو یونیورسٹی کا درجہ نہیں مِل سکا ہے، اور بابائے اُردو کی یہ دیرینہ آرزو ابھی تک پوری نہیں ہو سکی ہے ۔ مولوی صاحب کو اگر تھوڑا سا وقت اور مِل جاتا تو اُردو یونیورسٹی کے قیام کا یہ منصوبہ کبھی کا تکمیل سے ہم کنار ہو چکا ہوتا۔

این قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

پاکستان آنے کے بعد مولوی صاحب نے ہندوستان سے لُٹ پٹ کر آئے ہوئے لوگوں، خصوصاً نوجوانوں کو پاکستان میں از سرِ نو آباد کرنے کا کام بھی بڑی تن دہی اور لگن سے کیا ۔ بے شمار نوجوانوں کی تعلیم کے لئے انتظامات کئے ۔ بے شمار لوگوں کے لئے روزگار کا انتظام کیا ۔ بے شمار نوجوان طالب علموں کو وظیفے دیئے اور مختلف طریقوں سے بہت بڑے پیمانے پر اُن کی مالی امداد کی ۔ بے شمار نوجوانوں کو ملازمتیں بھی دلوائیں، بے شمار لوگوں کو اُن کے نئے گھروں میں آباد بھی کیا ۔ مولوی صاحب اِن فلاحی کاموں کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب میں نے اپنا مکان لاہور میں تعمیر کر لیا، اور مولوی صاحب کو اس کی اطلاع دی تو انہوں نے مجھے لکھا :۔

"مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی کہ آپ اب اپنے نئے گھر میں آبسے ہیں ۔ خُدا مبارک کرے ! کوئی غریب الدیار یا مہاجر اپنا گھر بنا لیتا ہے تو مجھے حقیقی مسرت ہوتی ہے ، اور میں خوش ہوتا ہوں کہ کم سے کم ایک تو آباد ہو گیا ۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن خستہ حال خانماں برباد مہاجرین میں سے پچاس فی صدی ، بیکاری ، بھوک ، بیماری جیسی مصیبتوں سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے ۔ باقی جو بچیں گے اُن کا اور اُن کی اولاد کا نہ معلوم کیا حشر ہو گا ۔ جب اس کا خیال آتا ہے تو دل پر چوٹ سی لگتی ہے ـــــ اور میں تو مہاجر ول

سے چاروں طرف سے گھرا ہوا ہوں۔ اندر اور باہر ہر طرف مہاجر ہی مہاجر ہیں۔ انجمن کے کالج میں پندرہ سو طالب علم ہیں تقریباً سب کے سب مہاجر ہیں۔ ان میں سے اکثر کی حالت قابلِ رحم ہے"۔

مولوی صاحب کی دلسوزی اور شفقت و محبت کے جذبات اُن کی اس تحریر کے ایک ایک لفظ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ بڑے نرم دل انسان تھے، اور کسی شخص کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب کسی کا کام خاطر خواہ ہو جاتا تھا اور اس کو طمانیت نصیب ہوتی تھی تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔

کراچی کے دورانِ قیام میں مولوی صاحب نوجوانوں کی تعلیم کی طرف خصوصی طور پر توجہ کی، اور بہت سے ایسے نوجوان جو ناسازگار حالات کی وجہ سے تعلیم کو خیرباد کہہ چکے تھے، اُنہوں نے اُن کو تعلیم کی طرف راغب کیا، اور یہ نوجوان مولوی صاحب کی شفقت اور محبت کی بدولت اپنی تعلیم کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اُنہوں نے اس زمانے میں اپنے آس پاس ایسے نوجوانوں کو جمع بھی کیا جن میں علمی ادبی کام کرنے کی صلاحیت تھی۔ مولوی صاحب نے انہیں علمی کام کے راستے پر ڈالا، اور دیکھتے دیکھتے اُن میں سے بیشتر لوگوں نے ادیبوں، محققوں اور نقادوں کی حیثیت سے علم و ادب کی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اِن لوگوں نے مولوی صاحب کی ہمت افزائی اور رہنمائی کی بدولت ادب میں اپنی تحریروں سے گراں قدر اضافے کئے، اور آج بھی اضافے کر رہے ہیں۔ جن لوگوں نے مولوی صاحب کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی وجہ سے علمی دُنیا میں گراں قدر کارنامے انجام دیئے، اُن میں مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، پروفیسر عزیز احمدؔ، شیخ چاند، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، جناب افسر امروہوی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں، محمد ایوب قادری، مشفق خواجہ، ابن انشا، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، شجاع احمد خاں زیبا

اور حبیب اللہ غضنفر وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان لوگوں نے ادب میں جو کام کیا ہے، اور تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے جو اہم کارنامے انجام دیئے ہیں، اُن سے ادب کے ساتھ دلچسپی رکھنے والا ہر شخص بخوبی واقف ہے۔

مولوی صاحب نوجوانوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے تھے۔ اُن کی تحریروں کو شوق سے پڑھتے تھے، اور اُن کے حوصلے بلند رکھنے کے لئے اکثر اُن کی تعریفیں بھی کر دیتے تھے۔ کتابوں اور ادبی رسالوں کا مطالعہ تو وہ باقاعدگی سے کرتے ہی تھے۔ روزانہ اخبارات میں جو ادبی مضامین شائع ہوتے تھے اُن کا مطالعہ بھی اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ عرصہ ہوا، غالباً آج سے تیس تیس سال قبل میں نے ایک مضمون احمد ندیم قاسمی صاحب کی فرمائش پر اخبار امروز میں لکھا تھا۔ بابائے اُردو نے نہ صرف اس کو پڑھا بلکہ اپنی یہ رائے مجھے ایک ذاتی خط میں تحریر فرمائی۔ مولوی صاحب کی رائے دلچسپ تھی، اور اس سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ عصر حاضر کے ادبی مسائل پر کتنی گہری نظر رکھتے، اس لئے اس کو یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:۔

"عزیزم سلمہٗ! امروز میں تنقید کا مضمون پڑھا۔ خوب لکھا ہے۔ بعض بڑی سچی باتیں لکھی ہیں۔ ان انگریزی کے اُستادوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اُنھوں نے انگریزی شاعری اور تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کیا کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے اور مشرق اور مشرقی ادب اور کلام کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ حالی کی نسبت تنقید کے استاد ادب تحریر فرماتے ہیں خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنا۔ دماغ و شخصیت اوسط ـــــ یہ ہے اُن کی تنقید کا نچوڑ۔ وہ اپنے آپ کو تنقید کا اجارہ دار سمجھتے ہیں۔ کسی اور کو تنقید کا حق نہیں۔ اگر لکھتا ہے تو جھک مارتا ہے، یاوہ گو ہے، تنقید کے اصول سے بے خبر ہے۔

حالی و شبلی تو رہے ایک طرف، میر و سودا پر بھی یہ الزام ہے کہ
انہوں نے انگلستان کی یونیورسٹیوں میں رہ کر، انگریزی شاعری اور
تنقید کی تعلیم نہیں پائی۔ آپ نے خوب کیا جو اُن کو جھنجھوڑا ہے۔
اُن کی مطبوعات سے لوگ ایسے مرعوب ہو گئے تھے کہ کسی کو اُن کے
خلاف کچھ کہنے کی جُرات نہیں ہوتی تھی"۔

اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اپنے عہد کے ادب اور تنقید کے رُجحانات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور اُن کے بارے میں اگر کوئی نیا لکھنے والا مثبت انداز میں اظہار خیال کرتا تھا، تو خوش ہوتے تھے، اور اس کی تعریف دیں بھی بُخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ بات یہ ہے کہ اُن کا مزاج ادبی تھا، اور وہ ایک ادبی انسان تھے۔ اور ادبی کام کرنے والوں پر اُن کی شفقت بے پایاں تھی۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک عظیم انسان، ایک بلند پایہ مُفکر اور دانش ور، ایک مُنفرد ادیب اور انشاء پرداز اور ادب کے ایک بہت بڑے نبّاض، محقق اور نقاد تھے۔ اُنہوں نے زندگی بھر اُردو ادب اور زبان کی خدمت کی، اور جب بھی اس کو کسی طرح کا خطرہ لاحق ہوا تو اُس کے لئے سینہ سپر بھی ہو گئے۔ اس کے لئے لڑائی بھی لڑی اور کبھی بھی اس معاملے میں ہار ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے کبھی سپر نہیں ڈالی۔ اُردو کے لئے اُن کا جہاد تقریباً ایک صدی تک جاری رہا۔

وہ سیاسی آدمی نہیں تھے۔ اُن کا میدان تو تہذیب و ثقافت تھا۔ تہذیبی و ثقافتی سطح پر انہیں قائداعظم کے دست راست کی حیثیت حاصل تھی۔ قائداعظم نے سیاست کے میدان میں جو کچھ اسلامیانِ ہند کے لئے کیا، وہ کام مولوی صاحب تہذیب و ثقافت کی سطح پر کرتے رہے۔ وہ بڑی بصیرت

والے انسان تھے، اور اُن کی دور رس اور دور بیں نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ زبان اور تہذیب و ثقافت کی طرف توجہ کئے بغیر، کوئی قوم، ایک قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ قائداعظم کو اِن معاملات میں اُن پر مکمل اعتماد تھا، اور وہ اُن کے خیالات و نظریات سے پوری طرح متفق تھے۔ اس لئے اُنہوں نے یہ کام مولوی صاحب کے سُپرد کر دیا تھا، اور اس میں کُچھ شبہ نہیں کہ اُنہوں نے اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ وہ دُھن کے پورے اور کام کے پکّے تھے، اور اُن کی یہی ادا قائداعظم کو پسند تھی۔

یہی سبب تھا کہ اس کام کو انجام دینے کے لئے قائداعظم نے اُن سے خود رابطہ قائم کیا۔ مولوی صاحب نے اس کی تفصیل اپنے ایک مضمون "قائداعظم اور اُردو" میں لکھی ہے، اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں :۔

مَیں سیاسی تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا۔ اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، خلافت وغیرہ میرے سامنے وجود میں آئیں، اور اُن کے ہنگامے بھی دیکھے۔ لیکن اِن میں کسی جماعت سے بھی سروکار نہ رکھا۔ ایک تو اس لئے کہ میں سلسلۂ ملازمت میں تھا۔ دوسرے میں اس کا اہل بھی نہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح سیاست اور قانون کے مردِ میدان تھے۔ اُن سے مِلنے جُلنے یا بات چیت کا شرف انہیں کو حاصل ہو سکتا تھا جو سیاست یا قانون سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے مجھے اُن سے مِلنے کا اتفاق نہ ہوا۔

۱۹۳۷ء میں شملے سے اُن کا ایک خط میرے نام آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ مسلمانوں کے قومی کاموں بالخصوص ہندی اُردو مسئلے سے گہری دلچسپی لے

رہے ہیں۔ ۱۵، ۱۶، ۱۷ اکتوبر کو لکھنؤ میں کُل ہند مسلم لیگ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ انہیں دنوں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بھی ہوگا۔ اگر آپ کونسل کے اجلاس میں شریک ہوں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ ہم ہندی اور اُردو کے بارے میں آپ کے خیالات معلوم کرنے کے مشتاق ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ زبان جیسے اہم مسئلے کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں مسلم لیگ کونسل کو آپ کے خیالات سے بڑی مدد ملے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس اجلاس میں ضرور شریک ہوں گے۔

اس کے دو روز بعد ہی علامہ اقبالؒ اور میاں بشیر احمدؒ بیرسٹرایٹ لا، اڈیٹر ھمایوں، کے خط آئے جن میں بہ تاکید یہ لکھا تھا کہ میں ضرور مسٹر جناح سے ملوں۔ میرا قیاس ہے کہ ملاقات کی یہ تحریک ڈاکٹر اقبالؒ نے کی ہوگی۔ اُن کو شاید یہ اندیشہ تھا کہ میں اہل کانگریس یا ہندی والوں سے کوئی ایسا سمجھوتہ نہ کرلوں جو اُردو کے حق میں مفید نہ ہو۔ اتفاق سے انہیں دنوں میرے مہرباں عبدالرحمٰن صدیقی صاحب جو حیدرآباد میں میرے مہمان تھے، وہ مُسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے، اور اس اجلاس میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ اُن کی رفاقت مجھے بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ روانگی سے پہلے بعض احباب کے مشورے سے ہم نے ایک رزولیوشن بھی اُردو کے متعلق تیار کرلیا تھا جو ہم مسلم لیگ کی کونسل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

لکھنؤ پہنچ کر میں صدیقی صاحب کے ہمراہ مسٹر جناح سے مِلا۔ انھوں نے سلام علیک کے بعد پہلا سوال یہ کیا کہ آپ ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔" میں نے کہا کہ آپ کچھ کرہی نہیں

رہے تو تعاون کس سے کروں ؟ (میرا اشارہ اُردو کے متعلق تھا)
فرمایا کہ "آئندہ ہم کریں گے" تو میں نے کہا میں ضرور تعاون کروں
گا۔ پھر میں نے رزولیوشن کا مسودہ اُن کے ملاحظے کے لئے
پیش کیا جسے انہوں نے شروع سے آخر تک پڑھا اور پسند
فرمایا۔"

غرض اس طرح قائداعظم سے اُن کی پہلی ملاقات ہوئی، اور پھر لکھنؤ،
دِلّی، الہ آباد، بمبئی حیدرآباد اور خصوصاً اینگلو عربک کالج دہلی میں اُن سے
مُلاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان مُلاقاتوں میں اُردو زبان کی ترقی کے لئے بے شمار
منصوبے بنائے گئے۔ اور ان کی بدولت مسلم لیگ بھی اُردو کی تحریک میں
دلچسپی لینے لگی۔ مسلم لیگ اور قائداعظم کے ساتھ مولوی صاحب کا یہ رابطہ
قیام پاکستان کے بعد تک جاری رہا جس کے نتیجے میں اُردو زبان کو بڑی
تقویت ملی، اور اس نے بابائے اُردو کی قیادت میں ترقی کی بے شمار منزلیں
طے کیں، بالآخر وہ پاکستان کی قومی زبان بن گئی۔

افسوس ہے کہ اُردو سے متعلق مولوی صاحب اور قائداعظم کے تمام
منصوبے اُن کی زندگی میں تکمیل سے ہم کنار نہ ہوسکے۔ وہ پاکستان کے ہر
شہری کو صحیح تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے تھے وہ
پاکستان کے ہر گھر میں صحیح اور صحت مندانہ تہذیبی اور ادبی ماحول پیدا کرنے
کے خواہش مند تھے۔ وہ اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی نشانی یعنی اُردو
زبان کو پاکستان کی سرکاری اور دفتری زبان بنانا چاہتے تھے۔ اُردو یونیورسٹی
کا قیام اُن کی دیرینہ خواہش تھی جن کو ہماری قوم کے نادان مغرب زدہ لوگوں
نے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے دیا۔ اور اس کے نتیجے میں ہماری قومی انفرادیت اور
ملی سیاست کی بھی دھجیاں اڑا دیں جس کے نتیجے میں ہماری قومی زندگی کی
حسین عمارت کے بام و در بھی ہل گئے۔ سیاست نے خود غرضی، مصلحت

کوشی اور زمانہ سازی کا روپ اختیار کر لیا۔ مختلف طرح کے تعصبات کی آندھیاں چلنے لگیں۔ اور اس صورتِ حال نے ہماری قومی و ملی زندگی کا شیرازہ منتشر کر دیا۔

اور پھر بعض لوگوں کی سازشوں کی وجہ سے انجمن ترقیٔ اُردو بھی انتشار کا شکار ہو گئی۔ یہ زمانہ مولوی صاحب کے لئے بڑی آزمائش اور پریشانی کا زمانہ تھا۔ انجمن جس کی آبیاری انہوں نے اپنے خون سے کی تھی۔ اُس میں ایک زلزلہ سا آگیا، اور اُس کی حسین عمارت ڈھے گئی۔ جن لوگوں کو انہوں نے سہارا دیا تھا، اور جو اُن کے پروردہ تھے، وہ بھی مولوی صاحب کے خلاف ہو گئے، اور مولوی صاحب کے لئے آستین کا سانپ ثابت ہوئے، اُنہوں نے مولوی صاحب کو ایسی ایسی اذیتیں پہنچائیں جن کو سُن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو اس کا بڑا دُکھ تھا، اور وہ اس کے شکوہ سنج تھے۔ لیکن ان ناسازگار حالات کے باوجود اُنہوں نے آخر دم تک ہمت نہیں ہاری۔ زندگی بھر لگن اور جذب و جنوں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اُن کے کارنامے بے شمار ہیں، اور ہماری قوم کا ہر فرد اُن کا ممنونِ احسان ہے کیونکہ اُنہوں نے اپنے گراں قدر علمی ادبی کاموں کے ساتھ ساتھ، قوم کو لسانی اور تہذیبی شعور سے آشنا کر کے ایک ایسی منزل کی طرف گام زن کرنے کی کوشش کی جس سے ہم کنار ہونا ہر قوم کا نصب العین ہوتا ہے۔

رفیع احمدؔ قدوائی

رفیع احمدؔ قدوائی صاحب بہت بڑے انسان دوست، نرم دل، مہذب، شائستہ اور شفقت و محبت والے انسان تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا درویش صفت اور اللہ والا انسان نہیں دیکھا۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور اُن کا مسلک بھی وہی تھا جس سے مولانا حسرت موہانی پہچانے جاتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مولانا حد درجہ جذباتی اور آئیڈیالسٹ تھے لیکن رفیع صاحب مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ عقل و خرد اور بصیرت و بصارت کی دولت بیش بہا سے مالا مال تھے۔ اُنہوں نے ساری زندگی کانگریس میں گذاری اور سیاست کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ غریب انسانوں اور خصوصاً مسلمانوں کی ایسی خدمت انجام دی جو اپنی مثال آپ ہے۔ اُن کے سینے میں ایسا دردمند دل تھا جو انسان کو محبت اور خدمت کے راستے پر گام زن کرتا ہے۔ اُن کی سیاست سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اُنہوں نے اپنی زندگی میں گرے پڑے انسانوں کی جو خدمت کی ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے اُن کی سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میں تو صرف اُن کی انسان دوستی، رحم دلی اور شفقت و محبت کی وجہ سے اُن سے محبت کرتا تھا۔ اُن کی سیاست کبھی اس راستے میں حائل نہیں ہوئی۔ میں نے اُنہیں بہت قریب سے دیکھا، اور اُن کی شخصیت میں مجھے انسان دوستی کی ایسی خصوصیات نظر آئیں جو میں نے اس دور کی کسی دوسری شخصیت میں نہیں دیکھیں۔

رفیع صاحب کے چھوٹے بھائی حسین کامل قدوائی لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے کلاس فیلو تھے۔ اُن کے توسط سے لکھنؤ میں رفیع صاحب کو کئی بار دیکھنے اور اُن سے ملنے کا موقع ملا۔ رفیع صاحب باتیں کم کرتے تھے۔ طبعاً وہ کم سخن تھے لیکن ہم لوگوں پر اُن کی شفقت بے پایاں تھی۔ اس زمانے میں وہ یوپی کی حکومت میں وزیر بھی ہو گئے تھے لیکن وزیر ہونے کے باوجود اُن کے انداز میں فرق نہیں آیا تھا۔ ہر ایک سے ملتے تھے اور نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ہم لوگوں پر تو اُن کی شفقت بے پایاں تھی۔ اپنی بے پایاں مصروفیت کے باوجود ہمارا حال احوال پوچھتے تھے، اور کھانے میں ہمیشہ اپنے ساتھ ہم لوگوں کو شریک کرتے تھے۔ اُن کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ کھانے کی میز پر ساٹھ ستر آدمی ضرور ہوتے تھے۔ رفیع صاحب ان میں سے ہر ایک کا حال احوال پوچھتے تھے، اور اصرار کر کے کھانے کی چیزیں اُن کی طرف بڑھاتے تھے۔ مہمان نوازی اُن پر ختم تھی۔

وہ لکھنؤ کے قریب ضلع بارہ بنکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں مسولی کے رہنے والے تھے۔ مسلم لیگ کے لیڈر چودھری خلیق الزماں صاحب کے قریبی عزیز تھے۔ چودھری صاحب تو کچھ عرصے کانگریس میں رہنے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ رفیع صاحب ہمیشہ کانگریس میں رہے۔ لیکن سیاسی اختلافات کی وجہ سے اُن کے رویے میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ چودھری صاحب اور اُن کے خاندان والوں کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، اور اُن کے ساتھ بڑی محبت

سے پیش آتے تھے۔ اُس زمانے میں سیاسی اختلاف محبت کی راہوں میں حائل نہیں ہوتا تھا۔

رفیع صاحب کی زندگی بہت سادہ تھی۔ ہمیشہ کھدر کا کرتا کھدر کا پاجامہ اور کھدر کی شیروانی پہنتے تھے۔ اُن کا گھر خاندان والوں عزیزوں اور دوستوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ خود گھر کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ صرف کھانے پر ان سب سے اُن کی ملاقات ہوتی تھی۔ اگر کوئی کھانے میں شریک نہیں ہوتا تھا تو وہ پوچھتے تھے کہ فلاں شخص کہاں ہے؟ وہ اپنے خاندان والوں سے اودھی زبان میں باتیں کرتے تھے لیکن دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اُردو بولتے تھے۔ اُن کا قیام تو لکھنؤ میں تھا لیکن وہ ہفتے میں دو تین دفعہ اپنے گاؤں مسولی ضرور جاتے تھے، اور اپنے آپ کو گاؤں کے لوگوں سے باخبر رکھتے تھے۔ ایک ایک گھر مل جا کر خیریت معلوم کرتے تھے۔ ان کے مسائل کو حل کرتے اور اُن میں سے بیشتر کی مدد کرتے تھے۔

یو پی کی حکومت میں کئی سال وزیر رہنے کے بعد وہ ہندوستان مرکزی حکومت میں وزیر مواصلات ہو گئے۔ اُن کے چھوٹے بھائی اور میرے کلاس فیلو حسین کامل قدوائی بھی دِلی میں ملازم ہو گئے، اور رفیع صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ میں بھی اینگلو عربک کالج میں ملازم ہو گیا۔ چنانچہ دِلی میں رفیع صاحب کو دیکھنے اور اُن سے ملنے کے نسبتاً زیادہ مواقع ملے۔ میں اس زمانے میں تنہا تھا اور کالج ہاسٹل کے اُس بلاک میں رہتا تھا جو اساتذہ کے لئے مخصوص تھا۔ اس لئے میں اکثر اپنے دوست حسین کامل سے ملنے کے لئے رفیع صاحب کے ہاں چلا جاتا تھا۔ وہ اس زمانے میں کنگ ایڈورڈ روڈ پر رہتے تھے۔ حسین کامل، اُن کی بیگم، اُن کی بڑی بہن بیگم انیس شفیع قدوائی، رفیع صاحب اور اُن کے خاندان کے تمام افراد میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ ان سب کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گذرتا تھا۔ رفیع صاحب تو بہت مصروف

رہتے تھے لیکن اُن سے بھی اکثر کھانے کی میز پر ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنے پاس بڑی شفقت اور محبت سے بٹھاتے، اصرار کر کے مختلف چیزیں مجھے کھلاتے اور مجھ سے دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں میں تقریباً ہر روز سہ پہر کے بعد اُن کے ہاں جاتا تھا، اور رات کے کھانے کے بعد اپنی جائے قیام اینگلو عربک کالج واپس آتا تھا۔

رفیع صاحب کی کوٹھی بہت بڑی تھی۔ وہ اپنی اس کوٹھی کے صرف ایک کمرے میں رہتے تھے۔ اس سے ملحق ایک کمرہ ملاقاتیوں کے لئے تھا۔ دوسرے کمروں میں اُن کے گھر والے، خاندان کے دوسرے لوگ اور مہمان وغیرہ سکون واطمینان کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک دو کمرے مہمانوں کے لئے وقف تھے، اِن کمروں کو کبھی خالی نہیں دیکھا گیا کیونکہ مہمان اُن کے ہاں بہت آتے تھے۔ میں نے ایسا مہمان نواز شخص اپنی زندگی میں کوئی اور نہیں دیکھا۔

اور یہ مہمان بھی عجب طرح کے تھے۔ کسی کو دِلّی میں کوئی کام ہو وہ بھی رفیع صاحب کا مہمان تھا، کسی کو ملازمت کی تلاش ہو وہ بھی رفیع صاحب کا مہمان تھا۔ کوئی بیمار ہو وہ بھی رفیع صاحب کا مہمان تھا۔ کوئی دِلّی کی سیر وسیاحت کے لئے آتا وہ بھی رفیع صاحب کا مہمان تھا۔ کوئی کسی کانفرنس، سیمینار یا جلسے میں شرکت کے لئے آتا وہ بھی رفیع صاحب کا مہمان تھا۔ کئی کئی دن تک بلکہ ہفتوں اور مہینوں اُن کے ہاں یہ مہمان رہتے۔ کبھی کسی سے گھر والے کہتے کہ آپ کو ہسپتال میں داخل کروا دیتے ہیں یا کسی اور جگہ آپ کا انتظام کر دیتے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ یہ کہتے کہ ہمیں یہاں بہت آرام ہے کیونکہ رفیع صاحب کی شخصیت کی ٹھنڈی چھاؤں ہمیں یہاں نصیب ہے۔ اور یہ ہمارے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ رفیع صاحب اِن مہمانوں سے روزانہ وقت نکال کر ملتے اور اُن کا حال احوال پوچھتے تھے۔ اور کھانے پر تو سب گھر والوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے۔ یہ گویا گھر والوں اور مہمانوں سے ملنے کا ایک بہانہ

تھا۔ رفیع صاحب سب کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ کئی باورچی انواع واقسام کے کھانے اِن کے لئے تیار کرتے تھے۔ رفیع صاحب اصرار کرکے یہ کھانے انہیں پیش کرتے تھے۔ خود رفیع صاحب کو اِن مرغن کھانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ زیادہ تر دال اور چاول کھاتے تھے۔ میں نے کھانے کی میز پر ساٹھ ستر، بلکہ بعض اوقات سو تک افراد رفیع صاحب کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔

رفیع صاحب تھوڑی دیر کے لئے صبح کو اپنے دفتر جاتے تھے۔ لیکن دو تین گھنٹے کے بعد واپس آجاتے تھے، اور زیادہ وقت اپنے مکان کے کمرے میں گذارتے تھے۔ یا تو پڑھتے رہتے تھے یا پھر سوچتے رہتے تھے۔ اور سیاسی منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ملنے والوں کا بھی اُن کے ہاں تانتا بندھا رہتا تھا۔ اُن کے کمرے کے برابر ایک کمرہ ملاقاتیوں کے لئے تھا۔ ملنے والوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اُن سے ملنے کے لئے اُس وقت کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی آتے تھے اور عام لوگ بھی۔ میں نے اُن کے ہاں خان عبدالغفار خاں، آصف علی، بیگم آصف علی، اچاریہ کرپلانی، راجیہ گوپال اچاری، ڈاکٹر امبیدکر، پنڈت سندرلال، سیّد علی ظہیر، سید سجاد ظہیر، مولوی محمد ابراہیم، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ عبداللہ، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، چودھری خلیق الزماں، نواب اسمٰعیل خاں، حسین امام صاحب، خاں عبدالقیوم خاں، مولانا حسرت موہانی، اور اسی طرح کے مختلف خیالات و نظریات رکھنے والے اس وقت کے چوٹی کے لیڈروں کو میں نے اُن کے ہاں آتے ہوئے اور گھنٹوں ان سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ باتیں تو رفیع صاحب کی اِن لیڈروں کے ساتھ بند کمرے میں ہوتی تھیں، اس لئے ہم لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ باتیں اس زمانے کے سیاسی

مسائل ہی پیدا ہوتی ہوں گی۔

یہ زمانہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا زمانہ تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست نے بڑی شدت اختیار کر لی اور رفیع صاحب اس میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے مفاد کا خیال ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ اُن کی سیاسی بصیرت کے سب ہی قائل تھے۔ اچاریہ کرپلانی اس زمانے میں کانگریس کے صدر تھے۔ وہ اکثر رفیع صاحب کے پاس آتے تھے اور گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھتے تھے "مگڑی کہاں ہیں؟" مگڑی کا لفظ وہ رفیع صاحب کی سیاسی بصیرت کے لئے استعمال کرتے تھے، اور اُن کی اس سیاسی بصیرت نے کانگریس کے اندر متعصب ہندوؤں کی سیاست کے بام و در ہلا کر رکھ دیئے تھے۔ پٹیل سے تو اُن کی بات چیت تک بند ہو گئی تھی۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو پٹیل نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ یوپی اور دلی میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ اس زمانے میں رفیع صاحب نے مسلمانوں کے لئے جو کچھ کیا، اُس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ رفیع صاحب نہ ہوتے تو دلی اور یوپی میں ایک مسلمان بھی باقی نہ بچتا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا، اُس میں رفیع صاحب نے لاتعداد مسلمانوں کی جانیں بچائیں، اور ایسے اقدامات کئے جن کی وجہ سے متعصب ہندوؤں کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

فسادات کی آگ تو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آزادی کے اعلان سے قبل ہی بھڑک اٹھی تھی لیکن اعلان آزادی کے ساتھ تو ہندوستان میں ایک قلزمِ خوں موج زن نظر آنے لگا۔ دلی بھی اس سے نہ بچ سکی، اور یہاں فسادات اس طرح ہوئے کہ دلی کے بیشتر مسلمان اپنے گھروں کو چھوڑ کر پُرانے قلعے میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ یہ کیمپ تو اینگلو عربک کالج کے اساتذہ

اور طلباء نے قائم کیا تھا، اور اس کو قائم کرنے میں رفیع صاحب نے ہماری بڑی مدد کی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ قلعہ ایک زمانے تک حشر کا میدان بنا رہا۔ لیکن اس کیمپ کی وجہ سے لاکھوں مسلمان محفوظ رہے۔ لاکھوں کی تعداد میں ریلوں کے ذریعے سے پاکستان پہنچے۔ بے شمار مسلمانوں کو رفیع صاحب نے ہوائی جہازوں کے ذریعے سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اُن کے گھروں تک پہنچایا۔ اور پاکستان کی مرکزی حکومت کے ملازمین بی۔ اے۔ او۔ سی کے طیاروں کے ذریعے کراچی پہنچے، جن کو قائداعظم نے خاص طور پر اسی مقصد کے لئے چارٹر کیا تھا۔ رفیع صاحب کی وجہ سے پرانے قلعے کے کیمپ میں بلوچ رجمنٹ کا پہرہ لگایا گیا جس سے اُن کے اندر تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ ایئرپورٹ تک مسلمانوں کو پہنچانے کے لئے انہوں نے مسلح فوجی فراہم کئے۔ اُن کی وجہ سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اسٹیشن سے پاکستان کے لئے ریلیں چلیں جن میں لاکھوں مسلمانوں نے مسلح فوجیوں کی حفاظت میں سفر کیا، اور وہ خیریت سے پاکستان پہنچے۔ اور جو دلّی میں رہنا چاہتے تھے، اُنہیں از سرِ نو اُن کے گھروں میں بسایا گیا۔

میری جان بھی اس زمانے میں رفیع صاحب ہی نے بچائی۔ مجھے اینگلو عربک کو چھوڑ کر پرانے قلعے میں آٹھ دس دن ہوگئے تھے۔ دو دن ہم لوگ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین صاحب کے ہاں بھی رہے تھے لیکن پھر کیمپ قائم کرنے کے لئے پرانے قلعے میں منتقل ہوگئے تھے۔ قلعہ حشر کا میدان بنا ہوا تھا۔ لاکھوں پناہ گزینوں کا مجمع تھا۔ اور وہ سب کھلے آسمان کے نیچے بے یار و مددگار پڑے ہوئے تھے۔ کھانا تو درکنار پینے کا پانی تک انہیں میسّر نہ تھا۔ بارش تھی کہ رُکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ کئی دن تک دلدوز مناظر کو دیکھ کر میں سخت پریشان ہوگیا۔ چنانچہ ایک دن وقت گذارنے کے لئے فجر کے وقت قلعے کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ یہاں مجھے میرے

پُرانے دوست شیخ مقبول الٰہی درویش مل گئے جو اپنے فوجی ٹرک میں مسلمانوں کو شہر سے نکال کر قلعے میں لا رہے تھے۔ اُنھوں نے میرا حال احوال پوچھا، اور کہنے لگے "میں اپنی جان پر کھیل کر زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو شہر کے مقتل سے نکال کر قلعے میں پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو کہیں جانا ہو تو میں آپ کو پہنچا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں قلعے کے ماحول سے پریشان ہو چکا ہوں۔ مجھے آپ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسن صاحب کے ہاں گل رعنا پہنچا دیجیے۔ وہاں میرے دوست پروفیسر خورشید احمد چشتی صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اُن سے ملوں گا اور غم غلط کر دوں گا۔"

یہ سُن کر مقبول الٰہی درویش نے مجھے اپنے ٹرک میں بٹھایا، اور چند منٹ میں پاکستان ہائی کمیشن پہنچا دیا۔ چشتی صاحب سے مل کر طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ دن میں نے اُن کے ساتھ گذارا۔ رات کو پاکستان ہائی کمشنر زاہد حسن صاحب کی طرف سے دی گئی ایک روٹی دال کے ساتھ کھائی۔ ہم لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ چشتی صاحب نے فون اُٹھایا، رفیع صاحب خود بول رہے تھے، کہہ رہے تھے "میں نے ایک بڑا جہاز لکھنؤ کی طرف جانے والوں کے لئے چارٹر کیا ہے۔ جو مسلمان لکھنؤ کی طرف جانے والے ہوں، وہ اس جہاز میں جا سکتے ہیں۔" چشتی صاحب نے کہا "میرے پاس عبادت صاحب بیٹھے ہیں۔ وہ یقیناً لکھنو جانا چاہیں گے کیونکہ اُن کے گھر والے لکھنؤ میں ہیں۔ آپ اُن سے بات کر لیجئے۔"

میں نے چشتی صاحب سے فون لیا۔ رفیع صاحب کی آواز آئی "بھئی، آپ کہاں ہیں؟ میں تو آپ کی خیریت نہ ملنے کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ آپ کے گھر سے روزانہ سنو کے قریب ٹیلی فون آتے ہیں۔ آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لئے ـــ میرا خیال تھا آپ جامعہ ملیہ میں ہوں گے۔

وہاں بھی معلوم کیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا"۔

میں نے کہا "میں تو اینگلو عربک کالج کے اساتذہ اور طلباء کے ساتھ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسن صاحب کے ہاں آگیا تھا۔ انہوں نے ہم لوگوں کو اپنے ہاں بلا لیا کیونکہ کالج پر حملے کا خطرہ تھا۔ ہم لوگ دو تین روز اُن کے ہاں رہے۔ پھر پرانے قلعے میں آگئے۔ کیمپ قائم کیا۔ ابھی تک میں وہیں ہوں۔ اساتذہ اور طالب علم بھی وہیں۔ آج میں ایک دوست کے ساتھ فوجی ٹرک میں زاہد حسن صاحب کے ہاں آیا تھا۔ میرے دوست پروفیسر چشتی صاحب نے مجھے یہاں روک لیا۔ اس میں کوئی مصلحت تھی۔ اگر یہاں نہ رکتا تو آپ کے ٹیلی فون کا مجھے علم ہی نہ ہوتا"۔

رفیع صاحب نے کہا "اب دلی میں مزید نہ ٹھہریے۔ حالات بہت خراب ہیں۔ تفصیل آپ کو زبانی بتاؤں گا۔ میں نے ایک جہاز لکھنؤ جانے والوں کے لئے چارٹر کیا ہے جو کل صبح پالم ایئرپورٹ سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگا۔ میں صبح منہ اندھیرے سرکاری گاڑی میں اپنے سکرٹری جے نرائن کو آپ کے پاس بھیجوں گا۔ دو مسلح فوجیوں کے ساتھ آپ میرے گھر آئیں گے۔ یہاں آپ ناشتہ کیجئے گا۔ پھر جے نرائن آپ کو یہاں سے پالم لے جائیں گے اور جہاز پر سوار کرائیں گے۔ میں چاہتا ہوں جو لوگ یہاں سے نکل سکیں بہتر ہے۔ کچھ اور لوگ بھی جانا چاہیں تو مجھے اطلاع دیجئے۔ ان کے بھی لکھنؤ جانے کا بندوبست ہو جائے گا۔ لکھنؤ میں امن ہے"۔

یہ سن کر میں نے کہا "میں صبح کو تیار رہوں گا اور جے نرائن کا انتظار کروں گا"۔

صبح کو جے نرائن رفیع صاحب کی گاڑی میں زاہد حسن صاحب کے ہاں گل رعنا میں آئے۔ اُن کے ساتھ دو مسلح فوجی بھی تھے۔ جے نرائن نے کہا "وقت کم ہے، بس چلئے"۔

میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لیکن میں نے اُن سے کہا "میں پہلے پرانے قلعے جاؤں

گا۔ اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہوں گا اور اپنا اٹیچی کیس لوں گا۔

چنانچہ جے نرائن مجھے پہلے پُرانے قلعے لے گئے۔ میں نے اپنے احباب کو رفیع صاحب کے ٹیلی فون کی خوشخبری سُنائی، اور کہا کہ میرے لکھنؤ جانے کا انتظام ہو گیا ہے۔ رفیع صاحب نے خصوصی طیارے کا انتظام کیا ہے۔ سب یہ سن کر خوش ہوئے اور انہوں نے خوشی اور غم کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ مجھے رُخصت کیا۔

چند منٹ میں جے نرائن نے مجھے رفیع صاحب کے ہاں پہنچا دیا۔

رفیع صاحب اس وقت اپنے لان میں ٹہل رہے تھے۔ آج میں نے زندگی میں پہلی دفعہ انہیں پریشان دیکھا۔ کہنے لگے "اچھا ہوا آپ سے رابطہ ہو گیا۔ ٹیلی فون پر آپ سے مِلنا ایک معجزہ ہے۔ یہاں تو کسی کو کسی کی کچھ خبر نہیں۔ شہر میں قتل عام ہو رہا ہے۔ ایئر پورٹ اور ریلوے اسٹیشن مقتل بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے دِلّی سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اسی لئے میں نے خصوصی جہاز چارٹر کئے ہیں۔ جو بھی یہاں سے نکل جائے بہتر ہے۔ آپ ناشتہ کر لیجئے، اور پھر جے نرائن کے ساتھ ایئر پورٹ چلے جائیے۔ مسلح فوجیوں کے ساتھ وہ آپ کو ایئر پورٹ لے جائیں گے اور جہاز میں بٹھائیں گے۔ دوپہر تک آپ لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔ میں نے انہیں ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ احتیاط سے جائیے گا۔ حسین کامل بھی وہاں آپ کے منتظر ہیں۔

یہ سن کر میں نے اندر جا کر ناشتہ کیا، اور پھر جے نرائن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چلتے وقت رفیع صاحب نے کہا "میں نے شہر کی حالت سُدھارنے کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مدراس رجمنٹ کو بُلایا جائے۔ ان لوگوں میں تعصب نہیں ہے۔ میں نے آپ کے کالج (اینگلو عربک کالج دہلی) کو ان کا ہیڈ کوارٹر بنوا دیا ہے۔ اس طرح آپ کا کالج بھی محفوظ رہے گا، اور شہر میں امن و امان قائم کرنے میں بھی مدد ملے گی"۔

یہ کہہ کر رفیع صاحب نے مجھے خدا حافظ کہا، اور مجھے جے نرائن کے ساتھ گاڑی میں بٹھایا۔ پیچھے دو مسلح فوجی سپاہی بیٹھے اور گاڑی پالم ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔

کوئی ایک گھنٹے میں، ہم لوگ پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ وہاں ہر طرف تلواریں اور کرپانیں لئے ہوئے سکھ ہی سکھ نظر آئے۔ ان کو دیکھ کر مجھے ڈر لگا، اور میں یہ سوچتا رہا کہ خدا جانے کتنے مسلمانوں کو یہ لوگ موت کے گھاٹ اُتار چکے ہوں گے۔ اب ہماری بھی خیر نہیں۔ لیکن سرکاری گاڑی مسلح فوجیوں اور جے نرائن کو دیکھ کر یہ لوگ یہ سمجھے کہ کوئی اہم آدمی کہیں جا رہا ہے۔ اس لئے خطرہ ٹل گیا۔

جے نرائن نے کاؤنٹر پر ٹکٹ وغیرہ دکھائے لیکن جہاز تین گھنٹے کی تاخیر سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوا۔ جے نرائن کے ساتھ میں سہما ہوا بیٹھا رہا۔ خدا جانے یہ تین گھنٹے کس طرح گزرے۔

بہر حال جب جہاز پرواز کے لئے تیار ہوا تو جے نرائن مجھے جہاز میں لے گئے، اور خود اندر جا کر مجھے جہاز میں بٹھایا، اور مجھے خدا حافظ کہا۔ تین گھنٹے کی پرواز کے بعد یہ جہاز اموسی کے ہوائی اڈے پر اُترا، اور اس طرح میں لکھنؤ پہنچ گیا۔ یہاں امن تھا۔ ہوائی اڈے سے میں سیدھا اپنے گھر پہنچا جہاں میرے گھر والے پریشانی کے عالم میں نظر آئے لیکن مجھے زندہ سلامت دیکھ کر خوش ہوئے۔

رفیع صاحب نے اس طرح میری جان بچائی۔ پُرانے قلعے کے ماحول سے مجھے نجات دلائی، اور مجھے میرے گھر پہنچایا۔ میں اُن کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ مجھ پر یہ احسان نہ کرتے تو میں زندہ نہ بچتا۔

میری تو خیر رفیع صاحب سے جان پہچان تھی، اُنہوں نے اُس زمانے میں اُن بے شمار مسلمانوں کے ساتھ یہی سب کچھ کیا جن کو وہ جانتے بھی نہیں تھے۔

اور پھر اُنہوں نے اپنی حکمت عملی سے مُسلمانوں کے بے شمار اداروں کو بچایا۔ مُسلمانوں کے بے شمار آثار کی حفاظت کی، بے شمار مسجدوں کو واگذاشت کرایا۔ بے شمار درگاہوں، اور بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے بے شمار مزاروں کو اصل حالت میں برقرار رکھا۔ ورنہ متعصب ہندوؤں کے منصوبے تو یہ تھے کہ دِلی میں مسلمانوں کی کسی چیز کو باقی نہیں رہنے دیں گے۔

رفیع صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اینگلو عربک کالج دہلی کو اپنی حکمت عملی اور بصیرت سے اصل حالت میں اور برقرار قائم رکھنا تھا۔ یہ کالج اُسی زمانے میں مسلم لیگ کا قلعہ اور تحریک پاکستان کا گڑھ تھا۔ مُتعصب ہندوؤں کی اس پر نظر تھی، اور وہ ایک منصوبے کے تحت اس کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اس کالج پر حملہ کرکے اس کو تباہ کرنے اور پروفیسرز اور طالب علموں کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن بروقت پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسن صاحب کو اس کی اطلاع مل گئی۔ چنانچہ اُنہوں نے اُستادوں اور ہوسٹل کے طالب علموں کو اپنے ہاں گل رعنا میں بُلا لیا، اور کالج کو مقفل کروادیا۔ متعصب ہندوؤں کا منصوبہ یہ بھی تھا کہ وہ اس کالج کو لاہور کے کسی ہندو کالج کو الاٹ کروادیں گے۔ لیکن رفیع صاحب کی بصیرت آڑے آئی، اور اُنہوں نے اس کالج کو مدراس رجمنٹ کا ہیڈکوارٹر بنوادیا۔ کئی مہینے اس رجمنٹ کے سپاہی اس کالج میں رہے۔ اس طرح یہ کالج محفوظ رہا، اور ان کی وجہ سے شہر میں امن قائم کرنے میں بھی مدد ملی۔ اور اس طرح متعصب ہندو جماعتوں کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

یہ رفیع صاحب ہی کا کارنامہ ہے کہ آج بھی یہ کالج مسلمانوں کا کالج ہے۔ اس کا پرنسپل مسلمان ہوتا ہے اور گورننگ باڈی کے ممبر بھی مسلمان ہوتے ہیں۔ البتہ طالب علموں کے لئے مسلمان ہونے کی کوئی پابندی نہیں اور یہ پابندی قیام پاکستان سے قبل بھی نہیں تھی۔

مسلمانوں کے لئے اُس دورِ پُرآشوب میں رفیع صاحب نے جو کچھ کیا وہ اس زمانے کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔
انہوں نے اس زمانے میں عصبیت سے پاک معاشرے کا خواب دیکھا جب ہرطرف تنگ نظری، تعصب اور وحشت و بربریت کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ اُنہوں نے اُس ماحول میں انسان دوستی، محبت اور خلوص کے چراغ روشن کئے جس وقت ہرطرف دشمنی اور وحشت و بربریت کی گھٹا ٹوپ اندھیاریاں چھائی ہوتی تھیں اُنہوں نے اُس فضا میں انسانوں کے زخموں پر مرہم رکھے جب تہذیب وثقافت زخموں سے چُور ہوکر بُری طرح چیخ رہی تھی۔ انہوں نے اس عہد میں مظلوم لوگوں کی حمایت کی جب معاشرے پر تباہی وبربادی کے بھیانک بھوت اپنی پوری بربریت اور جبر واستبداد کے ساتھ نہایت بے باکی کے ساتھ رقص کر رہے تھے۔

اُن کے کارنامے بے شمار ہیں۔ اُنہوں نے سیاست میں ہندو قدامت پرستی، مذہبی عصبیت اور پراچین کال کی تحریک کے اُمڈتے ہوئے طوفانوں کو روکا، اور اس پر بند باندھے۔ اُنہوں نے حکومت وقت کو انسان دوستی، شفقت اور محبت کے راستوں پر چلنے کے لئے آمادہ کیا۔ اُنہوں نے اپنے آس پاس ایک ایسی جمعیت پیدا کی جس نے تہذیب و شرافت اور انسانیت و دل سوزی کی مشعلوں کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے، اور مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی و تعلیمی اداروں کی رکھوالی کی، اور ان گنت افراد کی جانوں کو بچا کر، اُنہیں ایک نئی زندگی، ایک نئی دُنیا اور ایک نئے معاشرے کو قائم کرنے اور اُن کے درمیان اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کیا۔
یہ سب کچھ کرنے کے باوجود، اس بات کا افسوس ہے کہ وہ اس ہنگامہ رستاخیز میں اپنے سگے بھائی جناب شفیع احمد قدوائی کی جان نہ بچا سکے۔ شفیع صاحب اُس زمانے میں مسوری میں تھے جہاں اُنہیں متعصب

اور منتقم مزاج ہندوؤں اور سکھوں نے بیدردی سے قتل کر دیا۔ اُن کا جُرم صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، اور اپنے فرائض کو خلوص اور تن دہی سے ادا کر رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنے فرائض کو ادا کرتے ہوئے اپنی جان دے دی، اور اپنی بیوی محترمہ بیگم انیس شفیع قدوائی کو بیوگی سے اور بچوں کو یتیمی سے دوچار کر کے اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔ رفیع صاحب کو اس سانحے کا بڑا دکھ تھا، اور یہ دکھ انہیں مرتے دم تک رہا۔ یہ اور بات ہے کہ اُنہوں نے اپنے اِن عزیزوں کو زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ انہوں نے ان لوگوں کو بھی خدمت خلق کے جذبے سے سرشار کر کے دُکھی انسانیت کی خدمت کے راستے پر بھی گام زن کیا۔ مرحومہ انیس باجی نے تو اپنی ساری زندگی اِن کاموں کے لئے وقف کر دی، اور شاید اسی کے سہارے اپنے شوہر کی وفات کے اس صدمے کو برداشت کر سکیں جس کا خیال کر کے آج بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

رفیع صاحب بیواؤں، یتیموں، بیماروں، بیکاروں، مسافروں اور طالب علموں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُن کا گھران لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ دو تین کمرے اِن لوگوں کے لئے وقف تھے۔ حالانکہ وہ خود صرف گھر کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ لکھنؤ کے قریب بارہ بنکی کے ضلع میں اُن کی خاندانی جائیداد اچھی خاصی تھی۔ اس کی آمدنی بھی خاصی تھی لیکن اُس کا بیشتر حصّہ ضرورت مند عزیزوں، رشتے داروں اور غریبوں اور ناداروں پر صَرف ہوتا تھا۔ خدا جانے اُن کے کتنے عزیز اور رشتے دار اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ خدا جانے کتنی بیواؤں اور یتیموں کی وہ کفالت کرتے تھے۔ خدا جانے طالب علموں کے اخراجات وہ برداشت کرتے تھے۔ خدا جانے کتنی غریب لڑکیوں کی وہ شادیاں کرواتے اور اُن کو بساتے تھے۔ خدا جانے کتنے بیماروں کو وہ علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرتے تھے۔

یہ باتیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ سارا ہندوستان جانتا تھا۔ چنانچہ ضرورت منداُن کے پاس بے تکلفی سے آجاتے تھے، اور اُن کے ہاں قیام بھی کرتے تھے۔ بیماروں سے کہا جاتا تھا کہ آپ کو ہسپتال میں داخل کروا دیتے ہیں۔ لیکن اُن میں سے بیشتر یہی کہتے تھے کہ ہم ہسپتال جانا نہیں چاہتے آپ کے گھر میں ہمیں بڑا آرام ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کا علاج بھی گھر پر ہی ہوتا تھا، اور بالآخر وہ صحت یاب ہو کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تھے۔

سیاست سے رفیع صاحب کو دلچسپی تھی، اور وہ سو فی صد سیاسی آدمی تھے۔ سیاست میں اُن کے خیالات و نظریات کچھ بھی ہوں، لیکن وہ اُن کی سخاوت، شفقت اور محبت کی راہوں میں حائل نہیں ہوتی تھی۔ سیاسی اختلافات رکھنے کے باوجود وہ مخالفین کا احترام کرتے تھے، اور ہر طرح سے ذاتی معاملات میں اُن کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت اُنھوں نے بے شمار مسلمانوں کو پاکستان بھیجا تاکہ وہ وہاں اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ مسلم لیگ کے لیڈر اور تحریک پاکستان کے نامور رہنما چودھری خلیق الزماں صاحب اُن کے قریبی عزیز تھے۔ انہیں اور اُن کے خاندان کے تمام افراد کو پاکستان پہنچانے کے لئے رفیع صاحب نے ایک خصوصی طیارے کا انتظام کیا، جو اُس زمانے میں کسی طرح ممکن نہ تھا۔ یہ طیارہ لکھنؤ آیا۔ چودھری صاحب اور اُن کے خاندان کے تمام افراد اس طیارے میں دِلّی پہنچے۔ رفیع صاحب کے ہاں قیام کیا اور کئی دن کے بعد اسی طیارے میں کراچی روانہ ہوئے۔ رفیع صاحب نے اِن سب کو بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے رُخصت کیا، اور وہ سکون و اطمینان کے ساتھ کراچی پہنچے۔

رفیع صاحب کی سیاسی بصیرت کی دور دور شہرت تھی، اور ساری دنیا جانتی تھی کہ وہ ایک بااصول سیاست داں ہیں۔ وہ ذہین انسان تھے، اور

وہ غلط قسم کے جذباتی اور متعصب سیاست دانوں کو اپنی ذہانت سے زچ کر دیتے تھے۔ ایسے حالات پیدا کر دیتے تھے کہ اس قسم کے سیاست دان اُن کی تجاویز سے خود بخود مات کھا جاتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک واقع کو تو میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

یہ بات اب کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کانگریس میں پٹیل صاحب متعصب ہندوؤں کی سیاست کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ اُنہوں نے قیام پاکستان کو سب سے پہلے تسلیم ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ اس نئی مملکت کو تباہ کر کے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُنہوں نے جو کچھ کیا وہ اب ریکارڈ پر ہے۔ رفیع صاحب کو اُن سے اس معاملے میں شدید اختلاف رہا۔ یہاں تک کہ اُن سے بات چیت تک بند ہو گئی۔

حیدر آباد کی مسلم ریاست پر اُنہوں نے "پولیس ایکشن" کا نام دے کر حملہ کروایا۔ رفیع صاحب اس کے مخالف تھے۔ کیونکہ اس کا مقصد مسلمانوں کو تباہ کرنا تھا۔ اس حملے اور مسلمانوں کے قتل عام کے بعد انہوں نے ہندوستان پاکستان کی جنگ کا منصوبہ بنایا۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ انہوں نے کیبنٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ حیدر آباد میں کامیابی کے بعد مشرقی پاکستان پر بھی نام نہاد پولیس ایکشن کرنا چاہیئے کیونکہ وہاں فسادات میں ہندوؤں پر مظالم ہو رہے ہیں۔ رفیع صاحب کی بصیرت نے اس موقع پر بھی اپنا کام کیا۔ اُنہوں نے فوراً کہا کہ کمانڈر ان چیف کو بلایا جائے۔ چند منٹ میں کمانڈر ان چیف کیری اپا آ گئے۔ رفیع صاحب نے اُن سے پوچھا کہ مشرقی پاکستان پر حملے کے کیا نتائج ہوں گے۔ کیری اپا نے کہا "مشرقی پاکستان میں تو دو گھنٹے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اس عرصے میں دلی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا"۔ یہ سُن کر پٹیل صاحب کے چہرے پر

ہوائیاں اڑنے لگیں، اور انہوں نے اپنی احمقانہ تجویز واپس لے لی۔ یہ رفیع صاحب کی بصیرت کا کارنامہ تھا۔

رفیع صاحب کی سیاسی زندگی میں اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو انہیں ایک مثبت زاویۂ نظر رکھنے والا سیاست داں ثابت کرتے ہیں۔ وہ امن کے پیامبر تھے اور جنگ سے نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں جنگ سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ خواہ مخواہ بے گناہ انسانوں کا خون بہتا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ تمام معاملات کو سیاسی طور پر بات چیت کے ذریعے سے طے کرنا چاہیئے۔ وہ ساری زندگی اس کے لئے کوشاں رہے۔ اُن کے اس مثبت رویے سے ہندوستان کی سیاست میں توازن پیدا ہوا، اور نادان قسم کے متعصب سیاست دانوں کی دال نہ گل سکی۔

رفیع صاحب بڑے ہی رحم دل انسان تھے۔ اُن کی زندگی کا مقصد دُکھی انسانیت کی خدمت کرنا تھا۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اُن کی ذہانت و بصیرت، شفقت و محبت، اُن کا علم و شعور، جس سے وہ پہچانے جاتے تھے، ان سب کا ایک ہی مقصد تھا، ——— اور وہ مقصد تھا انسانوں کے زخموں پر مرہم رکھنا۔ زندگی بھر وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر انسانوں کے زخموں پر مرہم رکھتے رہے۔ اور اس کے لئے انہوں نے تن، من دھن سب کی بازی لگا دی۔ ہمیشہ درویشی کی زندگی بسر کی، اور اس راستے پر گامزن رہے جو ہمارے بزرگانِ دین، صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے ہمیں دکھایا تھا۔

اس اعتبار سے رفیع صاحب ایک منفرد شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ اُن کا خیال آتا ہے تو میرے دل کے نہاں خانے میں آج بھی بجلی کے قمقمے سے روشن ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب ادیب میرے محترم اُستاد تھے۔ عمرِ عزیز کے کئی سال میں نے اُن کے ساتھ ایک شاگرد کی حیثیت سے گذارے۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اُن کی شفقت مجھ پر بے پایاں تھی۔ جو آج بھی میرے لئے سرمایہ فخر و افتخار ہے۔

وہ اُردو فارسی دونوں زبانوں کے عظیم پروفیسر تھے، اور اُن کا زیادہ وقت اِن زبانوں کی تدریس و تحقیق میں گُذرتا تھا۔ اُن کے مزاج میں بڑی باقاعدگی تھی۔ جو کام بھی کرتے تھے نہایت تن دہی اور خلوص کے ساتھ کرتے تھے۔ سوائے پڑھانے، لکھنے پڑھنے اور علمی کام کرنے کے اُن کی کوئی اور دلچسپی نہیں تھی۔ اسی دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے فارسی اور اُردو کی نایاب کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اپنے کتب خانے میں جمع کیا تھا، اور دور دور سے اہل علم اُن کے ذخیرۂ کتب سے استفادہ کرنے کے لئے اُن کے پاس آتے تھے۔ زندگی بھر وہ اپنے اس کتب خانے میں اضافہ کرتے رہے، اور اس کام کو انجام دینے میں انہوں نے بڑی محنت کی، اور اس پر

زرکثیر بھی صرف کیا۔

اُنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ فارسی اور اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے لکھنؤ یونیورسٹی میں گذارا، اور تدریس و تحقیق کا اعلےٰ معیار قائم کیا۔ اُن کے طالب علم اُن کے نقشِ قدم پر چلے، اور اُن میں سے بیشتر نے ادبی دُنیا میں اپنا مقام پیدا کیا۔ مسعود صاحب نے ان کے ہاتھوں میں ذوق و شوق اور جذب و جنوں کی ایسی مشعلیں دے دیں جن کی روشنی میں وہ اپنے سفر پر روانہ ہوئے، اور شہرت و ناموری کی منزلوں سے ہم کنار ہوئے۔

میں جب ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوا، اُس وقت بھی وہ فارسی اور اُردو کے شعبے کے صدر تھے، اور جب میں بی۔ اے آنرز، ام۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے اُستاد ہو گیا، اُس وقت بھی وہ شعبۂ فارسی اور اُردو کے صدر تھے۔ تقریباً نصف صدی تک اُنھوں نے اس حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ بے شمار طالب علموں کو شفقت اور محبت سے پڑھایا اور ان کے ذوق ادب و شعر کی ایسی آبیاری کی کہ وہ ادب و تہذیب کا مثالی نمونہ بن کر دُنیا کے سامنے آئے۔

مسعود صاحب کا وطن تو اُناؤ کے ضلع میں ایک چھوٹا سا قصبہ نیوتنی تھا لیکن تعلیم انھوں نے لکھنؤ میں حاصل کی، اور پھر اس سرزمین مینو سواد نے اُن کا ایسا دامن پکڑا کہ وہ کبھی بھی اس سے باہر نہ نکل سکے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اُنھوں نے ابتدا میں یو پی کے محکمۂ تعلیم میں ملازمتیں کیں، لیکن بالآخر وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی اور اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے آ گئے اور اپنی ساری زندگی یہیں گذار دی۔ یونیورسٹی کے نہایت قابل اساتذہ میں اُن کا شمار ہوتا تھا، اور وہ اپنی دیانت و باقاعدگی، تہذیب و شائستگی، خلوص و محبت اور حُسنِ اخلاق کی وجہ سے یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا میں بہت مقبول تھے۔

ایک طالب علم کی حیثیت مجھے کئی سال تک انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بی۔اے آنرز میں وہ ہمیں فارسی زبان وادب کے دو پرچے پڑھاتے تھے۔ آنرز کی کلاس زیادہ بڑی نہیں ہوتی تھی۔ آٹھ دس طالب علم تھے۔ مسعود صاحب اِن طالب علموں کو اپنے کمرے ہی میں پڑھاتے تھے۔ لیکچر کا وقت ہوتا تھا تو طالب علم اُن کے کمرے میں چلے جاتے تھے، اور اُن کی دفتری میز کے آس پاس بیٹھ جاتے تھے۔ بغیر کسی تاخیر کے اُن کا لیکچر شروع ہوجاتا تھا، اور طالب علم اُن کی گل افشانیٔ گفتار سے مسحور ہوجاتے تھے۔

مسعود صاحب کا کمرہ اُن کا دفتر بھی تھا، لیکن دفتر کی فضا اس کمرے میں نہیں تھی۔ نہ کاغذات بکھرے ہوئے نظر آتے تھے نہ فائلیں ادھر اُدھر پڑی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ خدا جانے مسعود صاحب دفتر کا کام کس وقت کرتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں دفتری کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دفتری کاغذات اپنے پاس رکھتے نہیں تھے۔ جو کاغذ ڈین یا وائس چانسلر کی طرف سے آتا تھا، اس پر فوراً مناسب کارروائی کرکے واپس کردیتے تھے۔ اُن کے کمرے میں دفتری ماحول سے زیادہ لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا۔ کئی الماریاں کتابوں کی تھیں جن میں ضرورت کی کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ کمرے میں دو دروازے تھے، ایک مشرق کی طرف دوسرا مغرب کی طرف۔ دونوں دروازے کشادہ برآمدوں میں کھلتے تھے۔ دروازوں پر چِکیں پڑی رہتی تھیں، اور مغربی برآمدے میں ایک چپراسی بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن یہ چپراسی کسی کو کمرے کے اندر جانے سے روکتا نہیں تھا۔ کمرے کے اندر تین چار صراحیاں رکھی رہتی تھیں۔ اِن میں ٹھنڈے پانی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ کوئی بھی شخص پانی پینے کے لئے اس کمرے میں بے تکلفی سے اندر جا سکتا تھا۔ مسعود صاحب لیکچر دیتے رہتے تھے، لیکن پانی پینے والوں کے اندر آنے کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنا کام جاری رکھتے تھے۔ پانی پینے والے پانی پی کر باہر چلے جاتے تھے۔

ان لوگوں کے اندر آنے سے مسعود صاحب کا دھیان نہیں بٹتا تھا۔ دراصل چھوٹے پیمانے پر یہ ایک طرح کی سبیل تھی۔ طالب علم اس سے سیراب ہوتے تھے۔ مسعود صاحب نے خاص طور پر اس کا اہتمام کیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کارِ ثواب ہے۔

اس کمرے میں مسعود صاحب دس بجے سے پانچ دس منٹ پہلے ہی پہنچ جاتے تھے۔ دس بجے اُن کا لکچر ہوتا تھا۔ نو بجے کے قریب وہ اپنی کوٹھی سے چلتے تھے۔ یہ کوٹھی وکٹوریا اسٹریٹ کے قریب دین دیال روڈ پر تھی۔ یہاں سے وہ صبح کو نہایت عمدہ سوٹ میں ملبوس ہو کر اپنے ذاتی رئیسی تانگے میں سوار ہوتے تھے، اور یونیورسٹی چلے جاتے تھے۔ یہ تانگہ وکٹوریا روڈ، شاہ مینا روڈ، ریور بینک روڈ، چھتر منزل، ہوتا ہوا موتی محل کے پُل سے گذر کر کوئی پون گھنٹے میں یونیورسٹی پہنچتا تھا۔ اس سفر میں مسعود صاحب کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی تھی۔ راستے میں وہ پڑھتے جاتے تھے، کسی کی طرف دیکھتے نہیں تھے۔ انہیں اس تانگے میں کبھی کسی نے بغیر کتاب کے نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔

یونیورسٹی پہنچ کر وہ تانگے سے اُترتے اور دوسری منزل پر اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ چند منٹ بیٹھتے تھے۔ اپنا سامان وغیرہ سنبھال کر رکھتے تھے۔ پانوں کی ڈبیا پورٹ فولیو میں سے نکال کر پان کھاتے تھے۔ دس بجے اُن کا لکچر ہوتا تھا۔ طالب علم آجاتے تھے، اُن کو وہ ایک گھنٹہ سوا گھنٹے پڑھاتے تھے۔ یہ فارسی ام۔ اے کی کلاس تھی سوا گیارہ بجے جب یہ لکچر ختم ہو جاتا تھا تو ہم لوگ یعنی اُردو کے طالب علم اُن کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ ہم لوگوں کو اپنی اپنی جگہ پر بٹھا کر مسعود صاحب ٹوائلٹ جاتے تھے۔ اس عرصے میں میں اُن کے میز کی درازوں کا جائزہ لیتا تھا، اِن میں پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ رکھا رہتا تھا۔ مسعود صاحب کے واپس آنے سے قبل میں اور میرے کلاس

قیلو دُلارے لال ماتھراُن کی ڈبیا میں سے نکال کر ایک ایک گلوری پان کی کھاتے تھے، اور منہ بند کرکے چپکے سے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ مسعود صاحب کو اس کا علم نہ ہوا ہو لیکن انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ چشم پوشی کرتے تھے، اور درگذر فرماتے تھے۔ اس صورت حال نے ہم لوگوں کو کچھ زیادہ ہی جُرأت مند اور بے باک بلکہ گستاخ بنا دیا تھا۔

تھی تو یہ بُری بات لیکن مسعود صاحب کے پان اتنے مزے دار ہوتے تھے کہ میں اور میرے ایک ہم جماعت دلارے لال ماتھر دونوں اس قسم کی "چوری" کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے تھے۔ اور پھر مسعود صاحب کی شفقت پر ہم لوگوں کو خاصا اعتماد تھا، اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ اگر انہیں ہماری اس حرکت کا علم ہو بھی گیا تو وہ ہم سے ناراض نہیں ہوں گے۔ ہم دونوں آپس میں یہ باتیں کرکے اپنے دل کو سمجھاتے تھے کہ جب مسعود صاحب ہم سب کے لئے پانی کا اہتمام کرتے ہیں تو اُن کے پان کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

خوئے بد را بہانہ بسیار!

مسعود صاحب کو ہماری اس حرکت کا علم بخوبی تھا۔ اس کا اندازہ ہم لوگوں کو اس وقت ہوا جب ہم نے اُن کے دولت خانے پر حاضری دی تو انہوں نے اپنے مُلازم کو بُلا کر یہ کہا کہ "اندر سے پان لائیے۔ یہ میرے شاگرد پانوں کے بہت شوقین ہیں۔"

اور اُن کی یہ بات سُن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

مسعود صاحب ہم لوگوں کو گیارہ سوا گیارہ بجے پڑھانا شروع کرتے تھے، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور پڑھاتے تھے اُن کا لکچر فارسی ادبیات پر ہوتا تھا لیکن وہ اِن لکچروں میں علم کے خزانے لُٹاتے تھے، اور ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کر دیتے تھے۔ معاشرتی اور تہذیبی پس منظر میں وہ ادب اور شاعری

پر ایسی باتیں کرتے تھے کہ جی خوش ہو جاتا تھا، اور ہم لوگ اُن کی باتوں سے مسحور ہو جاتے تھے ۔ اُن کی گل افشانیٔ گفتار میں واقعی ایک ساحرانہ کیفیت تھی۔

یونیورسٹی میں مسعود صاحب بہت لئے دیئے رہتے تھے۔ کبھی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتے تھے ۔ اُن کو کبھی کسی نے یونیورسٹی کے برآمدوں میں گھومتے ہوئے یا کسی دفتر میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی دوسرے پروفیسر کے کمرے میں بھی وہ نہیں جاتے تھے ۔ اُن کے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ وہ اس طرح ضائع کرتے ۔ وہ تو یونیورسٹی میں صرف پڑھاتے تھے، اور ایک بجے سے قبل ہی اپنے مخصوص تانگے میں سوار ہو کر واپس گھر چلے جاتے تھے ۔ آخر وقت تک اُن کا یہی معمول رہا۔ گھر پر بھی اُن کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی کوئی اور دلچسپی نہیں تھی۔

مسعود صاحب کا ذاتی کتب خانہ لکھنؤ میں اپنے طرز کا واحد کتب خانہ تھا۔ زندگی بھر وہ فارسی اور اُردو کے نادر و نایاب قلمی نسخے اور قدیم کتابوں کے مطبوعہ نسخے جمع کرتے رہے تھے ۔ مراثی کا توان کے پاس ایسا ذخیرہ تھا جو دُنیا میں کسی کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے فارسی اور اُردو کے مرثیوں کی قدیم بیاضیں بڑی محنت سے جمع کی تھیں۔ شعراء کے دیوان اور فارسی اور اُردو شعراء کے تذکرے بھی انہوں نے بڑے شوق سے جمع کئے تھے۔ ان کتابوں کو وہ سینت سینت کر رکھتے تھے ۔ کسی کو دکھاتے نہیں تھے ۔ البتہ جس پر اُن کو اعتماد ہوتا تھا، وہ اُن کے ہاں جاکر اُن نادر و نایاب کتابوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لاہور، دہلی، علی گڑھ، حیدرآباد دکن اور پٹنہ سے علمی اور تحقیقی کام کرنے والے اُن کے کتب خانے سے استفادہ کرنے کے لئے آتے تھے، اور مسعود صاحب ایسے اہل علم کے لئے اپنے کتب خانے کے دروازے کھول دیتے تھے۔

مجھ پر تو اُن کی شفقت بے پایاں تھی۔ میں قدیم قلمی نسخوں اور مطبوعہ کتابوں کا رسیا تھا۔ اس لئے اُن کی خدمت میں اتوار کو ضرور حاضر ہوتا تھا۔ اطلاع کرواتا تھا تو مسعود صاحب فوراً باہر تشریف لے آتے تھے۔ اُن کی کوٹھی کے برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز اور چار کرسیاں پڑی رہتی تھیں ہم لوگ وہاں بیٹھ جاتے تھے۔ مسعود صاحب مجھ سے خاصی دیر تک باتیں کرتے تھے، اور پھر جن کتابوں کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اُن کو نکلوا کر اپنے مطالعے کے کمرے میں رکھوا دیتے تھے۔ ایک دو بجے تک میں وہاں کام کرتا تھا، اور پھر گھر واپس آجاتا تھا۔

مسعود صاحب کے ہاں جائے نہیں ملتی تھی۔ اُن کا ڈرائنگ روم بھی نہیں کُھلتا تھا۔ ان کے مطالعے کے کمرے میں بھی کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمیشہ برآمدے میں بیٹھتے تھے، اور یہیں ملاقاتیوں سے ملتے تھے۔ مجھے یہ کُھلی فضا، اچھی لگتی تھی۔ برآمدے کے سامنے کشادہ لان تھا اور اس لان میں اونچے اونچے درخت جھومتے تھے۔ میں ان درختوں اور دُور تک پھیلے ہوتے سبزے سے لُطف اندوز ہوتا تھا، اور مسعود صاحب کی گل افشانیٔ گفتار سے مسحور ہو جاتا تھا۔ وہ مجھے خاصا وقت دیتے تھے اور نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی آفاق صاحب بھی اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ہاکی کے مشہور و معروف کھلاڑی تھے۔ وہ بھی اکثر باہر آجاتے تھے، اور اُن کی دلچسپ باتیں بھی میرے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ اتوار کو چار پانچ گھنٹے میں وہاں گذارتا تھا۔ میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ مسعود صاحب میری موجودگی سے پریشان ہو رہے ہیں۔ اُن کا اخلاق بہت بلند تھا، اور وہ کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ اُس کی موجودگی اُن کے لئے باعث پریشانی ہے، اور یہ کہ اس کی وجہ سے ان کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔

گرمی ہو، سردی ہو، آندھی ہو، پانی ہو، مسعود صاحب اسی برآمدے میں بیٹھتے تھے، اور ملنے والوں سے اسی برآمدے میں ملتے اور باتیں کرتے تھے۔ جو بھی آتا تھا، وہ اسی برآمدے میں اُن کے پاس بیٹھ جاتا تھا اور مسعود صاحب کی گل افشانئ گفتار کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ کبھی تھکتے نہیں تھے۔ بلا مبالغہ گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ لیکن اُن کی باتوں کی روانی اور ان کے لہجے کی شیرینی میں کبھی فرق نہیں آتا تھا۔ اُن کی زبان کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور اُن کی زبان سے جو الفاظ نکلتے تھے وہ شہد و شکر میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ایسی دلکش باتیں کرنے والے اپنی زندگی میں کم ہی دیکھے ہیں۔

مسعود صاحب کی گفتگو کے موضوعات متنوع ہوتے تھے۔ کبھی مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر پر بات کرتے تھے۔ خاص طور پر اودھ کی حکومت، لکھنؤ کی تہذیب اور نوابان اودھ اور ان کے زمانے کے شعر و ادب پر جب وہ باتیں کرتے تھے تو ایک سمندر اُمڈتا تھا ایسی معلومات فراہم کرتے تھے جو عام طور پر کتابوں میں نہیں ملتی — اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کا ذکر ہوتا تھا تو اُن پر رقت طاری ہو جاتی تھی، اور وہ انگریزوں کے مظالم کے واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والوں کی آنکھیں بھی پُرنم ہو جاتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ انگریزوں نے واجد علی شاہ کو بہت بدنام کیا، اُن کی عیش کوشی اور ہوس کاری کی داستانوں کو عام کیا۔ اس کا مقصد سیاسی تھا۔ وہ اودھ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اس لئے اُنہوں نے یہ داستانیں بنائیں — لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ واجد علی شاہ بڑے ہی دین دار اور باکردار انسان تھے۔ ادب، شاعری، موسیقی، رقص اور دوسرے فنون لطیفہ سے انہیں گہری دلچسپی تھی، اور وہ اسی دُنیا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد ایک سو چالیس سے زیادہ ہے۔ جو شخص اتنا علمی کام کرے وہ عیاشی کے لئے وقت

کس طرح نکال سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ واجد علی شاہ اپنے نظام حکومت کو نئی بُنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی فوج کی بھی تنظیم نو کی تھی۔ خود فوجی پریڈ میں شریک ہوتے تھے۔ انگریزوں کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ چنانچہ وہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہوگئے، اور احساس تحفظ ڈر اور خوف نے انہیں آپے سے باہر کردیا۔ چنانچہ انہوں نے ایسی حرکات کیں جو انسانیت کے جسم پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اور مسعود صاحب کی یہ باتیں غلط اور بے بُنیاد نہیں ہوتی تھیں۔ اُن میں مبالغہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ مسعود صاحب نے اودھ کی تاریخ و تہذیب اور ادب و شعر کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس عہد کی تقریباً تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف اُن کے کتب خانے میں موجود تھیں، اور وہ یہ باتیں انہیں کتابوں کے حوالے سے کرتے تھے معلومات کا ایک خزانہ اُن کے دل و دماغ میں محفوظ تھا۔ اودھ کی تاریخ و تہذیب اور ادب و شعر کا اتنا بڑا مزاج داں میں نے اپنی زندگی میں کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔

ایک دن میں اُن کے پاس بیٹھا تھا کہ لکھنؤ کے نوابوں کا ذکر چھڑ گیا۔ مسعود صاحب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ لکھنؤ کے نوابوں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نوابوں کے وثیقے کم سے کم ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے شرفا کی مالی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔ یہ تہذیب مٹ رہی ہے، ختم ہو رہی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کو سمجھنے والا بھی کوئی باقی نہ رہے گا۔

پھر فرمایا کہ "لکھنؤ کے نوابوں نے ہر چیز کو فن بلکہ فن لطیف بنا دیا تھا۔ رہن سہن، خورد و نوش اور آداب معاشرت میں ان لوگوں نے بلند معیار قائم کئے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس زمانے کی ہر شے ایک فن لطیف بن گئی۔ پھر انہوں نے اس زمانے کے ایک باورچی کا واقعہ سُنایا۔

کہنے لگے "ایک باورچی ملازمت کے لئے کسی نواب صاحب کے ہاں گیا۔ نواب صاحب نے پوچھا "میاں! کون کون سی چیزیں پکا لیتے ہو۔"؟

اُس نے جواب دیا "حضور! میں صرف چنے کی دال پکاتا ہوں۔"

فرمایا "بھئی چنے کی دال کوئی کب تک کھائے گا؟"

اُس نے کہا "میاں! میں ایک مہینے تک دونوں وقت صرف ایسی چیزیں پکاکر پیش کروں گا جس میں صرف چنے کی دال استعمال ہوگی۔"

نواب صاحب نے اس کو ملازم رکھ لیا، اور اُس نے واقعی ایک مہینے تک صرف چنے کی دال سے مختلف قسم کے کھانے اس طرح پکائے جو نہایت لذیذ تھے، اِن کھانوں کو شوق سے کھایا گیا، نواب صاحب نے اس باورچی کے فن کی داد دی، اور وہ ساری زندگی نواب صاحب کی خدمت کرتا رہا۔"

لکھنؤ کے اُردو شاعروں سے مسعود صاحب کو دلچسپی تھی۔ ویسے وہ دہلوی شاعروں کے بھی پرستار تھے لیکن لکھنوی شعراء کا مطالعہ انہوں نے بڑی محنت اور دلچسپی سے کیا تھا، اور اُن کی شاعری میں ایسے ایسے پہلو تلاش کئے تھے جن کی طرف اس سے قبل کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ انہوں نے آتش، ناسخ، انیس، دبیر، عزیز، صبا، وزیر، رشک، اسیر، امیر مینائی، اور صفی وغیرہ کے مطالعے میں خاصا وقت صرف کیا تھا، اور ان شاعروں نے اردو کی شعری روایت میں جو اضافے کئے تھے، اپنے مضامین میں اُس کی وضاحت کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنوی شعراء کے کلام کو پڑھنے، اُن کے شاعرانہ فن کو سمجھنے، اور اُن سے لُطف اندوز ہونے کا ماحول پیدا ہوا، اور لوگ اُن کے کلام کو شوق سے پڑھنے لگے۔

مسعود صاحب نے مختلف اُردو شاعروں کے مطالعے کے ساتھ اُن کے آثار کو محفوظ کرنے کا کام کیا۔ چنانچہ ان شاعروں کے مکانوں اور ان

مزاروں کو محفوظ کرنے کے لئے خاصی محنت کی، اور یہ انہیں کا کارنامہ ہے
کہ آج اِن شاعروں کے آثار لکھنؤ میں محفوظ ہیں۔
ایک دن مجھ سے فرمایا "آپ کو معلوم ہے میر تقی میر کا مزار کہاں ہے؟
میں نے کہا "مجھے کچھ علم نہیں ہے"۔
کہنے لگے "میں نے اُن کے مزار کو تلاش کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔
یہ مزار سٹی ریلوے اسٹیشن کے پاس ریلوے لائن کے قریب اکھاڑہ بھیم کے
قبرستان میں ہے۔ اگر آپ کسی وقت میرے ساتھ چلیں تو میں آپ کو دکھا
سکتا ہوں"۔

میں نے کہا "آپ جب بھی فرمائیں گے، میں آپ کے ساتھ چلوں گا"۔
مسعود صاحب نے فرمایا "ابھی چلتے ہیں"۔
چنانچہ انہوں نے اپنے ڈرائیور کو بلایا۔ اپنی موٹر کار نکالی، اور ہم اس
میں سٹی ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ ریل کے پل کے پاس گاڑی
روکی۔ بائیں جانب اوپر کی طرف کچھ قبریں نظر آئیں۔ ایک قبر زیادہ نمایاں
تھی اور اُس پر چادر چڑھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک بوڑھی عورت ملی۔
مسعود صاحب نے اُس عورت سے پوچھا "بڑی بی! یہ کس کا مزار ہے"؟
اُس نے کہا "یہ شاہ جشن کا مزار ہے۔ میرے میاں کو فیض آباد میں یہ
بشارت ہوئی تھی کہ اس جگہ جاؤ، اور شاہ جشن کے مزار پر حاضری دو۔ کئی
سال ہوئے ہم یہاں آگئے۔ میرے شوہر کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ اب میں
اس مزار کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ اسی سے گذر بسر ہو جاتی ہے"۔
یہ سُن کر مسعود صاحب میری طرف مخاطب ہوئے، اور کہا "یہ میر تقی میر
کا مزار ہے۔ بچپن میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل مجھے اس کا علم ہوا تھا،
اور بزرگوں نے باوثوق ذرائع سے مجھے بتایا تھا کہ یہی میر صاحب کا مزار
ہے۔ لیکن اب اس بڑھیا نے اس کو شاہ جشن کا مزار بنا دیا ہے"۔

میں یہ سُن کر حیران و پریشان ہوا۔ مسعود صاحب محقق تھے، اور کبھی غلط بات نہیں کرتے تھے۔ میں اُن کی باتیں سُن کر دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر فاتحہ پڑھی، میر صاحب کے لئے دعائے خیر کی اور یہ سوچتا رہا کہ قدرت کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ اُس نے میر صاحب کے مزار کو شاہ جشن کا مزار بنا دیا۔

خاصی دیر تک ہم لوگ وہاں رہے۔ میں مسعود صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد، ہم لوگ میر صاحب کے مزار کی زیارت کر کے واپس آئے۔

میرے لئے یہ عجیب و غریب تجربہ تھا۔

ایک دن میں مسعود صاحب کے ہاں پہنچا تو فرمانے لگے "ناسخ کے مزار کا تو علم ہو گیا ہے۔ دریائے گومتی کے کنارے شمال کی جانب گئو گھاٹ پر ناسخ کے والد اور اُن کی والدہ کی قبریں میں نے تلاش کر لی ہیں۔ ابھی میرے ساتھ چلئے، آپ کو دکھاؤں گا۔"

چنانچہ ہم لوگ پروفیسر صاحب کی موٹر میں کوئی چھ میل کا فاصلہ طے کر کے گئو گھاٹ پہنچے۔ وہاں میدان میں دو قبریں نظر آئیں ان میں سے ایک پر لکھا تھا "مزار اُمّ ناسخ" اور دوسری پر لکھا تھا مزار پدرِ ناسخ"۔

پروفیسر صاحب نے کہا کہ اِن مزاروں سے اِس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ جب ناسخ کے والدین کا انتقال ہوا ہے تو اُس وقت اُن کی شہرت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اِن مزاروں پر "امّ ناسخ" اور پدر ناسخ کے بجائے اُن کے والدین کے نام لکھے ہوتے"۔

میں نے اُن کے خیال سے اتفاق کیا اور کہا کہ "آپ صحیح فرماتے ہیں"

کچھ دیر ہم لوگ وہاں رہے۔ پھر گھر واپس آئے۔

غرض مسعود صاحب اس قسم کے کام بھی کرتے رہے، اور خاصی تعداد

میں انہوں نے لکھنؤ میں شاعروں اور ادیبوں کے مزاروں کو تلاش کرکے ان کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح پرانی کتابوں کو حاصل کرنے کا شوق بھی مسعود صاحب کو نہ صرف کتب فروشوں بلکہ لکھنؤ کے قدیم محلوں کے مکینوں کے پاس بھی لے جاتا تھا۔ جب بھی علم ہوتا تھا کہ فلاں محلے کے فلاں گھر میں فلاں صاحب کے پاس قلمی اور مطبوعہ نسخے ہیں، وہ وہاں پہنچ جاتے تھے، اور کتابیں خرید لاتے تھے۔ کچھ لوگ، کبھی کبھی اُن کے مکان پر بھی کتابیں فروخت کرنے کے لئے آجاتے تھے، اور مسعود صاحب یہ کتابیں خرید لیتے تھے۔ البتہ قیمت کے معاملے میں بحث ضرور ہوتی تھی۔

ایک دن میں اُن کے ہاں بیٹھا تھا کہ قدیم وضع قطع کے ایک صاحب کسی شاعر کا ایک قلمی نسخہ لے کر آئے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ بڑی ہی نادر کتاب تھی۔ میں نے بھی وہ کتاب دیکھی، اور اس کو دیکھ کر میری رال بھی ٹپکی لیکن میں مسعود صاحب کے سامنے اس کا اظہار نہ کر سکا۔ اور مسعود صاحب نے کچھ روپے دے کر وہ نادر و نایاب نسخہ خرید لیا۔

اس طرح مسعود صاحب زندگی بھر نادر و نایاب کتابیں جمع کرتے رہے، اور اُنہوں نے ایک ایسا ذاتی کتب خانہ بنالیا جو اپنی مثال آپ تھا، اور ہندوستان میں جس کی دور دور تک شہرت تھی۔ مسعود صاحب اپنی اِن کتابوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ کبھی اِن کتابوں کو باہر نہیں نکالتے۔ البتہ بعض اسکالرز جن پر مسعود صاحب کو اعتماد تھا، وہ اُن کے مکان پر آ کر، اُن کی خصوصی اجازت سے ایک خاص کمرے میں بیٹھ کر ان کتابوں سے استفادہ کر سکتے تھے۔ اب یہ نادر و نایاب کتب خانہ اُن کے صاحب زادے ڈاکٹر نیر مسعود کی تحویل میں ہے۔

پروفیسر صاحب زندگی بھر علمی کاموں میں مصروف رہے۔ اُنہوں نے

میں انہوں نے لکھنؤ میں شاعروں اور ادیبوں کے مزاروں کو تلاش کر کے ان کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح پرانی کتابوں کو حاصل کرنے کا شوق بھی مسعود صاحب کو نہ صرف کتب فروشوں بلکہ لکھنؤ کے قدیم محلوں کے مکینوں کے پاس بھی لے جاتا تھا۔ جب بھی علم ہوتا تھا کہ فلاں محلے کے فلاں گھر میں فلاں صاحب کے پاس قلمی اور مطبوعہ نسخے ہیں، وہ وہاں پہنچ جاتے تھے، اور کتابیں خرید لاتے تھے۔ کچھ لوگ، کبھی کبھی اُن کے مکان پر بھی کتابیں فروخت کرنے کے لئے آجاتے تھے، اور مسعود صاحب یہ کتابیں خرید لیتے تھے۔ البتہ قیمت کے معاملے میں بحث ضرور ہوتی تھی۔

ایک دن میں اُن کے ہاں بیٹھا تھا کہ قدیم وضع قطع کے ایک صاحب کسی شاعر کا ایک قلمی نسخہ لے کر آئے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ بڑی ہی نادر کتاب تھی۔ میں نے بھی وہ کتاب دیکھی، اور اس کو دیکھ کر میری رال بھی ٹپکی لیکن میں مسعود صاحب کے سامنے اس کا اظہار نہ کر سکا۔ اور مسعود صاحب نے کچھ روپے دے کر وہ نادر و نایاب نسخہ خرید لیا۔

اس طرح مسعود صاحب زندگی بھر نادر و نایاب کتابیں جمع کرتے رہے، اور اُنہوں نے ایک ایسا ذاتی کتب خانہ بنا لیا جو اپنی مثال آپ تھا، اور ہندوستان میں جس کی دور دور تک شہرت تھی۔ مسعود صاحب اپنی اِن کتابوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ کبھی اِن کتابوں کو باہر نہیں نکالتے۔ البتہ بعض اسکالرز جن پر مسعود صاحب کو اعتماد تھا، وہ اُن کے مکان پر آ کر، اُن کی خصوصی اجازت سے ایک خاص کمرے میں بیٹھ کر ان کتابوں سے استفادہ کر سکتے تھے۔ اب یہ نادر و نایاب کتب خانہ اُن کے صاحب زادے ڈاکٹر نیر مسعود کی تحویل میں ہے۔

پروفیسر صاحب زندگی بھر علمی کاموں میں مصروف رہے۔ اُنہوں نے

"ہماری شاعری" لکھی جو اُردو شاعری خصوصاً غزل کی شاعری پر ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اُنہوں نے اس کتاب میں اُردو شاعری کی ایسی وکالت کی ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ آزاد کی آب حیات کا تنقیدی مطالعہ بھی ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ انہوں نے مرثیے پر بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ بے شمار مرثیوں کو سامنے رکھ کر انہوں نے روح انیس شائع کی اور اُس پر مقدمہ بھی لکھا۔ میر تقی میر کے رسالے 'فیض میر' کو بھی تلاش کر کے اُنہوں نے پہلی بار شائع کیا۔ واجد علی شاہ اختر پر بھی اُنہوں نے قابل قدر کام کیا، اور ان کے حالات، شخصیت اور علمی، ادبی اور فنی کارناموں پر ایک ایسی کتاب شائع کی جس میں نیا مواد تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی نادر و نایاب کتاب 'فسانۂ عبرت' بھی انہوں نے مرتب کر کے ایک جامع مقدمے کے ساتھ شائع کی۔ "متفرقات غالب" بھی انہوں نے مرتب کی جس میں غالب پر نیا مواد تھا۔ اور آخر میں انہوں نے "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" اور "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" کے نام سے دو کتابیں تو ایسی لکھ کر شائع کیں جو تحقیق و تنقید کا شاہکار ہیں، اور جو مسعود صاحب کو اس موضوع پر اُردو کا سب سے اہم محقق اور نقاد ثابت کرتی ہیں۔

یہ کام ایسے ہیں جو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ مسعود صاحب اس نوعیت کے بے شمار کام اور بھی کر سکتے تھے۔ لیکن دو چیزیں اُن کے اس راستے میں حائل رہیں۔ ایک تو اُن کی صحت کی خرابی، خاص طور پر دردِ سر، جس نے زندگی بھر اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا، دوسرے اپنے علمی کاموں کو ترتیب و تالیف اور طباعت و اشاعت میں غیر معمولی احتیاط جو پروفیسر صاحب کے مزاج کا لازمی جز تھا۔ اسی وجہ سے اُن کے بہت سے علمی، تحقیقی اور ادبی کام ادھورے رہ گئے، اور وہ علمی دُنیا کے سامنے نہ آسکے۔ بہرحال جو بھی اُن کا علمی کام منظر عام پر آیا ہے، وہ اُردو میں گراں قدر اضافے کی

حیثیت رکھتا ہے۔

ویسے یہ حقیقت ہے کہ وہ ہر وقت علمی ادبی کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے، اور شاید درد سر کی تکلیف جو ساری زندگی انہیں پریشان کرتی رہی، اُس کا سبب بھی یہی علمی کام تھا اُن کی یہ مصروفیت روز بہ روز بڑھتی گئی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکثر مہمانوں کو دعوت دے کر بھی بھول جاتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں لاہور سے چند روز کے لئے لکھنؤ گیا، تو پروفیسر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ صبح کو ناشتہ کرنے کی دعوت دی۔ میں آٹھ بجے سے پہلے ہی اُن کے ہاں پہنچ گیا۔ کوئی دو تین گھنٹے وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ ناشتہ نہیں آیا، نہ اُس کی کوئی بات ہوئی۔ گیارہ بجے کے قریب مجھے اتنی بھوک لگی کہ میں بے چین ہوگیا۔ چنانچہ میں نے اُن سے اجازت لی، اور چوک میں اکبری دروازے کے اندر جا کر ایک ریستوراں میں ناشتہ کیا۔ مسعود صاحب کو یاد ہی نہیں رہا کہ انہوں نے مجھے ناشتے کی دعوت دی تھی۔ علمی مزاج کے لوگوں کے لئے اس طرح بھولنا بھی کوئی عجیب بات نہیں۔ بڑے پروفیسر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

پروفیسر صاحب مذہبی آدمی ضرور تھے لیکن مذہب پر کبھی باتیں نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر شاگردوں کے سامنے تو وہ کبھی بھی مذہبی موضوعات کو نہیں چھیڑتے تھے۔ مذہب سے اُن کی دلچسپی کا اندازہ محرم کے موقع پر ہوتا تھا۔ محرم کے ابتدائی دس دنوں میں وہ عزاداری کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ آخری تین دن اُن کے ہاں بڑے اعلےٰ پائے کی مجلسیں ہوتی تھیں، اور عام طور پر ان مجلسوں میں مولانا سید علی نقی نقن صاحب اپنی خطابت اور اپنے علم کے جوہر دکھاتے تھے۔ نقن صاحب کا مزاج فلسفیانہ تھا، اور وہ نہایت روشن خیال مجتہد تھے۔ اُن کی مجلس کیا ہوتی تھی، ایک بڑا ہی عالمانہ لکچر ہوتا تھا، جس میں مذہب، الٰہیات، فلسفہ، نفسیات، اخلاق، تاریخ غرض تمام علوم کا

احاطہ کر لیتے تھے۔ صرف اِن مجلسوں میں استادِ محترم مجھے ہر سال شرکت کی دعوت دیا کرتے تھے، اور میں بڑی باقاعدگی سے اُن کی اِن مجلسوں میں شریک ہوتا اور مجتہدالعصر نقن صاحب کے افکار و خیالات سے استفادہ کرتا تھا۔

علمی ادبی کاموں کو جانچنے اور پرکھنے میں مسعود صاحب بہت سخت تھے۔ یونیورسٹی میں ان کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ کسی خوش قسمت ہی کو اُن کے ہاتھ سے فرسٹ کلاس کے نمبر مل سکتے ہیں۔ مجھے انہوں نے ام۔اے فائنل کے امتحان کے ایک پرچے میں ساٹھ سے کچھ نمبر زیادہ دیئے تھے، اور یہ میری خوش قسمتی تھی۔ اور جب میری کتابیں شائع ہوئیں تو اُن میں سے بھی بعض کتابوں کو انہوں نے پسند فرمایا، اور اِن کتابوں کی تعریف کی۔ یہ سب کچھ اُن کی شفقت اور محبت تھی، اور اس کو بھی میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ایک ایسے اُستاد اور ادیب نے میری کتابوں کو سراہا جن کے ادبی معیار بہت سخت تھے۔

جب میری کتاب ’روایت کی اہمیت‘ کا ایک نسخہ جو آپ نے بھیجا تھا، مُدّت ہوئی مجھے مل چکا ہے اور ادب کی خدمت کی جو اُمیدیں آپ کی ذات سے وابستہ ہوئی تھیں، اُنہیں پورا ہوتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ کتاب کو آئے ہوئے اتنے دن ہو گئے، اور مجھے اس کی رسید بھیجنے کی اب توفیق ہوئی ہے“۔

اسی طرح جب میری کتاب ”غزل اور مطالعہ غزل“ میں نے اسی زمانے میں پڑھی تھی جب وہ مجھے وصول ہوئی تھی۔ اُسے پڑھ کر جو خوشی مجھے ہوئی تھی، وہ شاید ہی کسی اور کو ہوئی ہو۔ اپنے مقصد کو پورا ہوتے دیکھ کر کس کو خوشی نہ ہوگی۔ جب اُردو غزل پر ہر طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہو رہی تھی تو سب سے پہلے میں نے ”ہماری شاعری“ لکھ کر اس طوفان کو روکا تھا، اور غزل فہمی کے لئے زمین ہموار کی تھی۔ اب آپ نے یہ کتاب لکھ کر اس عمارت کو بہت اونچا اٹھا دیا جس

کی داغ بیل میں نے ڈالی تھی۔ معنوی اعتبار سے اُستاد اور شاگرد میں وہی نسبت ہوتی ہے جو صلبی حیثیت سے باپ اور بیٹے میں ہوتی ہے۔ فارسی کی ایک مشہور مثل ہے" اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند"۔ آپ نے یہ کتاب لکھ کر اس مثل کو اصل کر دکھایا۔"

یہ مسعود صاحب کی شفقت اور محبت ہی تھی کہ میں نے اُن کی تصانیف پر جب بھی تبصرہ کیا تو اُنھوں نے اس کو پسند فرمایا، "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" پر میرے تبصرے پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ نے ایک ذاتی خط میں انہوں نے تحریر فرمایا۔

"لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" پر جو تبصرہ آپ نے لاہور ریڈیو سے نشر کیا تھا، اُس کی نقل کل مجھے وصول ہوئی۔ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ ادب کی جو خدمت محض خدمت کے شوق میں کی جائے، اُس کا بہترین صلہ تحسین سخن شناس ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنتوں کا یہ صلہ ہر طرف سے مل رہا ہے۔ آپ کے تفصیلی تبصرے نے کتاب کی نوعیت اور اہمیت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔"

اور جب مسعود صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ادبی انعام ملا تو اُنھوں نے جو کچھ مجھے تحریر فرمایا اس کو پڑھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ انھوں نے مجھے ایک خط میں لکھا۔

"ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملنے پر آپ کو یقیناً مسرت ہوئی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اکیڈمی کو بہترین کتاب کے انتخاب میں نقادوں کے تبصروں سے بہت مدد ملی ہوگی ان تمام نقادوں کو جنھوں نے اس کتاب کو ایک بلند پایہ تصنیف قرار دیا تھا اس بات سے بھی خوش ہونا چاہئے کہ اکیڈمی نے اُن کے فیصلے کو تسلیم کرلیا، اور ان نقادوں میں آپ بھی شامل ہیں ـــــ 'افکار' میں 'فسانۂ عبرت' پر

آپ کا تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو۔ آپ کی نئی کتاب تنقیدی تجربے ابھی تک مجھ کو نہیں ملی"۔

اُستادِ محترم پروفیسر مسعود حسن صاحب کی یہ تمام تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ مجھ پر ہمیشہ شفقت فرماتے تھے۔ میری تحریروں کو اہمیت دینا درحقیقت اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے ایک ناچیز شاگرد کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے تھے، ورنہ ان تحریروں میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

میں مسعود صاحب کا ایک ادنٰے شاگرد تھا لیکن وہ میرے خلوص پر اعتماد رکھتے تھے۔ اس لئے اپنے بعض ذاتی کام بھی میرے سپُرد کر دیتے تھے، اور میں اُن کی خدمت کو اپنا فرضِ اولین سمجھ کر اُن کے احکام کی تعمیل کیا کرتا تھا۔

اُن کے بڑے صاحب زادے اختر مسعود صاحب جب ہجرت کر کے پاکستان آئے تو انہوں نے اُن کی دیکھ بھال میرے سپُرد کی، اور مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ میں نے اُن کے لئے کیا، اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مسعود صاحب اس سے خوش ہوئے چنانچہ ایک ذاتی خط میں انہوں نے مجھے تحریر فرمایا۔

"اختر میاں نے جو خط مجھے لاہور سے لکھے ہیں اُن میں آپ کے اور عزیزی وزیر الحسن صاحب عابدی کے حُسن سلوک کا ذکر احسان مندی اور شکر گذاری کے جذبات میں ڈوب کر بڑے پُر اثر انداز میں کیا ہے۔ ایک بزرگ کے حس انسانیت سوز طرز عمل سے پریشان ہو کر، وہ یہاں سے گئے ہیں اس کے مقابلے میں آپ لوگوں کے پُرخلوص ہمدردانہ برتاؤ کو دیکھ کر اُن کے دل کو بہت تسکین ہوئی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے!

انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ نے بہت اصرار سے اُن کو

اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی تھی مگر وہ کسی مجبوری سے اپنی قیام گاہ بدل نہ سکے۔ اختر میاں کی والدہ اپنے سب سے بڑے اور اپنے سب سے زیادہ سعید فرزند کی مفارقت میں بہت مغموم رہتی ہیں۔ اُن کی دِلی تمنّا ہے کہ اگر اختر کو ترک وطن کرنا ہی پڑے تو وطن کی سرحد سے جس قدر قریب رہ سکیں اُتنا ہی اچھا ہے تاکہ کم وقت، کم زحمت اور کم صرف میں آنا جانا ہو سکے۔ اسی لئے وہ لاہور کو دوسرے مقاموں پر ترجیح دیتی ہیں مگر معلوم نہیں کہ آب و دانے کی کشش اُن کو کہاں لے جاتی ہے۔"

اختر میاں میرے چھوٹے بھائی کی طرح تھے، اس لئے اُن کی خدمت میرا فرض تھا۔ میں نے اپنا یہ فرض ادا کیا۔ شکر ہے کہ وہ جلد ہی پہلے اڈورڈز کالج پشاور اور پھر پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں اُستاد ہو گئے۔ اس طرح میرا بوجھ ہلکا ہوا، اور اُستاد محترم محترم پروفیسر مسعود صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ کو طمانیت نصیب ہوئی۔

بہرحال مسعود صاحب ایک عظیم انسان، ایک شفیق اُستاد، ایک بلند پایہ ایک منفرد محقق نقاد اور ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ میں نے اُن سے بہت کچھ حاصل کیا، اور ادب اور تحقیق و تنقید سے جو تھوڑی سی دلچسپی میرے حصے میں آئی، اور ادبی کام کرنے کا جو معمولی سا ذوق و شوق میرے اندر پیدا ہوا، اس میں اُستاد محترم پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کی شفقت اور محبت کا خاص ہاتھ ہے، اور اس کے لئے میں ہمیشہ اُن کا ممنون احسان رہوں گا۔

جب بھی اُن کا خیال آتا ہے، اور یہ خیال اکثر آتا ہے، تو احترام کے خیال سے میری گردن جھک جاتی ہے اور زبان پر یہ الفاظ آجاتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے مقامات کو بلند فرمائے!

مولانا محمدؐ حسین

میں جب لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا تو شعبۂ اُردو میں مجھے ایک شفیق اُستاد مولانا محمدؐ حسین صاحب ملے۔ میں نے بی۔ اے، بی۔ اے آنرز اور ام۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے پانچ چھ سال اُن کے قدموں میں گذارے، اور اُن سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اُن کے مزاج میں اتنی نرمی اور شفقت تھی کہ ہر طالب علم اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ میں بھی یونیورسٹی کے دوران قیام میں پانچ چھ سال تک اُن کا گرویدہ رہا۔

مولانا اپنے طالب علموں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُن کو بڑی محبت اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ بڑی باقاعدگی سے کلاس میں آتے تھے۔ کبھی غیر حاضر نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کلاس نہیں چھوڑتے تھے۔ طالب علموں کا حال احوال پوچھتے رہتے تھے، اُن کے مسائل سے باخبر رہتے تھے۔ ہر سطح پر اُن کی مدد بھی کرتے تھے۔ ہر طالب علم کو بخوبی جانتے تھے۔ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ اُن کا کون سا طالب علم کہاں رہتا ہے اور اس کے مشاغل کیا ہیں۔ وہ کلاس کے باہر بھی طالب علموں سے ملتے تھے، اور اُن کو مفید مشورے دیتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ طالب علموں کا اُن کے آس پاس جمگھٹا رہتا تھا۔ میں نے طالب علموں کے معاملات و مسائل سے اتنی دلچسپی لینے والے شفیق استاد میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ مولانا اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا بڑے ہی فرض شناس انسان تھے۔ صبح کو وہ اپنی پرانی سی سائیکل پر یونیورسٹی آجاتے تھے، اور سہ پہر تک یونیورسٹی ہی میں رہتے تھے۔ وہ روزانہ بی۔ اے، بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کی جماعتوں کو تین چار لکچر ضرور دیتے تھے۔ دو ایک ٹوٹوریل بھی لے لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ طالب علموں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ مولانا ان طالب علموں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اُن کے مسائل سنتے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ سوائے طالب علموں کو لیکچر دینے، اُن کو پڑھانے اور اُن سے تبادلۂ خیال کرنے کے اُن کی کوئی اور دلچسپی نہیں تھی۔

وہ بڑے ہی سادہ مزاج انسان تھے۔ لباس تک کا انہیں کوئی خاص خیال نہیں رہتا تھا ہمیشہ اور ہر موسم میں شیروانی اور علی گڑھ کٹ کا تنگ پائچوں کا پاجامہ پہنتے تھے۔ سر پر اودھ کی خاص کشتی نما ٹوپی ضرور ہوتی تھی۔ شیروانی کے بٹن گلے تک بند رہتے تھے۔ گرمیوں میں پسینہ بہتا تھا، اور شیروانی سے باہر نکل آتا تھا۔ پسینے میں ڈوبے ہوئے مولانا پڑھاتے بھی تھے، اور انفرادی طور پر طالب علموں سے ملتے اور باتیں بھی کرتے تھے۔ سوائے سائیکل کے انہوں نے کبھی کوئی اور سواری استعمال نہیں کی۔ اسی پرانی سائیکل پر یونیورسٹی آتے تھے، اور اپنا کام ختم کر کے سہ پہر کو گھر واپس چلے جاتے تھے۔ اُن کا مکان نادان محل روڈ پر تھا۔ گھر کے سامنے مسجد تھی۔ مولانا کا زیادہ وقت اس مسجد میں گذرتا تھا۔ مسجد میں وہ ہر وقت عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ مولانا کی صحت اچھی تھی۔ تقریباً چھ فٹ کا قد، گٹھا ہوا بھاری بھرکم جسم، گول چہرہ، چہرے پر چیچک کے داغ، گندمی رنگ، چمکدار آنکھیں، نوجوانوں

کی طرح مضطرب اور بے چین ـــــ بس اس وضع قطع اور انداز سے وہ یونیورسٹی میں چلتے پھرتے، پڑھاتے طالب علموں سے باتیں کرتے اور سگریٹ پیتے ہوئے نظر آتے تھے۔

یونیورسٹی کے طالب علم اور اُستاد انہیں مولانا کہہ کر پکارتے تھے۔ حالانکہ نہ تو اُن کے چہرے پر داڑھی تھی نہ مونچھیں ـــــ نہ وہ عبا قبا میں ملبوس نظر آتے تھے۔ داڑھی اور مونچھیں چہرے پر چیچک کے داغوں کی وجہ سے نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اور پھر مولانا روزانہ شیو کرتے تھے۔ اس لئے اُن کا بھاری بھرکم گول چہرہ صاف ستھرا اور صحت مند نظر آتا تھا۔ ہر طالب علم اُن کی عزت کرتا تھا، اور انہیں دیکھتے ہی سلام کرتا تھا، مولانا طالب علموں کے سلام کا جواب ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی سے دیتے تھے، اور پوچھتے تھے "کہو بھئی! کیا خیال ہے؟ اچھے تو ہو!"

اور طالب علم جواب میں کہتے تھے "الحمدُللہ! اللہ کا شکر ہے۔ مولانا! آپ کی نوازش ہے، کرم ہے۔"

مولانا شعبۂ اُردو کے سینئر اساتذہ میں تھے۔ اور بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے فاضل تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو کی بے شمار ڈگریاں اُن کے پاس تھیں، اور وہ ان زبانوں کے ماہر تھے۔ لسانیات اور ادبیات سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ اور وہ اِن موضوعات کے مختلف پہلوؤں پر بڑی ہی عالمانہ باتیں کرتے تھے۔ اُن کا خاص مضمون اُردو زبان اور ادب تھا۔ اس زمانے میں پرانے اساتذہ کے پاس اُردو کی ڈگری نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان کے زمانے میں یونیورسٹیوں میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم کا باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔ اس لئے عربی فارسی کے فاضل اساتذہ ہی کو اُردو پڑھانے کا کام دے دیا جاتا تھا۔ مولانا نے اُردو زبان و ادب کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا تھا، وہ اس موضوع سے متعلق تمام پہلوؤں کو اس طرح واضح کرتے تھے کہ

طالب علموں کے سینوں میں علم و شعور کا ایک خزانہ جمع ہو جاتا تھا، اور وہ علمی ادبی موضوعات پر نہایت اعتماد کے ساتھ باتیں کرنے لگتے تھے۔

بی۔ اے کی جماعت اس زمانے میں بہت بڑی ہوتی تھی۔ سو سے زیادہ طالب علم ہوتے تھے۔ بڑے کمرے میں دور دور تک طالب علم ہی طالب علم نظر آتے تھے۔ لیکن مولانا کے لیکچر دینے کا انداز ایسا ہوتا تھا، اور اُن کی آواز ایسی پاٹ دار تھی کہ آخری صف میں جو طالب علم بیٹھتے تھے، وہ بھی اُن کے لیکچر کو بخوبی سُن سکتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کی آواز طالب علموں تک نہ پہنچی ہو۔ مولانا کی شفقت طالب علموں پر ایسی تھی کہ وہ اُن کے لیکچروں میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ پھر اُن کی باتیں بھی نہایت دلچسپ ہوتی تھیں۔ طبیعت میں بذلہ سنجی بھی خاصی تھی۔ اس لئے طالب علم اُن کی باتوں سے بہت لُطف اندوز ہوتے تھے۔

کلاس شروع ہونے سے قبل مولانا دو چار دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ اس کے بعد اپنا رجسٹر کھولتے، اور حاضری کے لئے بلند آواز میں ہر طالب علم کا نام پُکارتے تھے۔ طالب علم 'حاضر جناب' یا 'یس سر' کہہ کر اپنی حاضری لگواتے۔ اگر کوئی طالب علم موجود نہ ہوتا تو مولانا پوچھتے "بھئی کسی نے اس کو کہیں دیکھا ہے۔ اگر دیکھا ہو تو بتاؤ، میں حاضری لگا دوں"۔ طالب علموں کی طرف سے یہی جواب ملتا۔ "مولانا! انہیں دیکھا تو ہے۔ یونیورسٹی میں تو موجود تھے۔ خدا جانے کلاس میں کیوں نہیں آئے۔ ہو سکتا ہے لائبریری میں دیر ہو گئی ہو"۔ یہ سُن کر مولانا کلاس میں غیر حاضر طالب علم کی بھی حاضری لگا دیتے تھے۔ حاضری لگانے کی مولانا کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ ہمیشہ کہتے تھے۔ "بھئی حاضریاں کم نہ ہو جائیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ طالب علم خواہ مخواہ امتحان میں شریک ہونے سے روک لئے جاتے ہیں"۔

بی۔ اے کی کلاس میں ٹینس کے مشہور و معروف کھلاڑی غوث محمد خاں،

جو اس زمانے میں کئی سال تک ہندوستان کے نمبر ایک کھلاڑی رہے، میرے کلاس فیلو تھے۔ وہ یونیورسٹی آتے تو اُن کے ہاتھ میں ریکٹ ہوتا تھا۔ دن بھر وہ یونیورسٹی میں ٹینس کھیلتے تھے — لیکن اُردو کی کلاس میں کبھی کبھی آجاتے تھے۔ مولانا حاضری لیتے ہوئے جب اُن کا نام پکارتے، اور وہ کلاس میں موجود ہوتے تو بہت خوش ہوتے تھے، اور کہتے تھے کہ "ہم سب کی خوش نصیبی ہے کہ غوث محمد خاں کلاس میں آئے ہیں، خوش آمدید!"

یہ سُن کر غوث محمد خاں کہتے تھے۔ "مولانا! میں آپ کے لکچر میں ضرور حاضر ہوتا ہوں۔ اُردو زبان وادب سے مجھے دلچسپی ہے — اور پھر آپ کے لیکچر سے میں مستفید ہوتا ہوں" — آپ کا ادنیٰ شاگرد ہوں" —

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ غوث ہندوستان کے دوسرے شہروں میں یا ہندوستان کے باہر ٹینس کھیلنے کے لئے چلے جاتے تھے، تو مولانا حاضری لیتے ہوئے فرماتے تھے طالب علموں سے مخاطب ہو کر "بھئی غوث محمد خاں آج کلاس میں موجود نہیں ہیں۔ اگر وہ ہندوستان میں موجود ہوں تو اُن کی حاضری لگا دوں۔ اُنھوں نے ہندوستان اور لکھنؤ یونیورسٹی کے نام کو بہت بلند کیا ہے۔ انہیں تو یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری ملنی چاہیئے۔

یہ سُن کر لڑکے خوش ہوتے تھے اور یک زبان ہو کر کہتے تھے کہ اُن کی حاضری ضرور لگا دیجئے وہ ہندوستان ہی میں ہیں۔"

اور یہ سن کر مولانا اُن کی حاضری لگا دیتے تھے۔ حاضری کے معاملے میں مولانا کے مزاج میں بڑی نرمی تھی۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا مولانا محمد حسین صاحب کے مزاج میں بذلہ سنجی بہت تھی۔ وہ نہایت حاضر جواب تھے۔ لکچر شروع کرنے سے پہلے وہ کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ضرور کرتے تھے، اور اُن کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ کلاس زعفران زار بن جاتی تھی۔ مولانا خود بھی ہنستے تھے اور لڑکوں کو بھی

ہنساتے تھے۔

ایک دن ایک لڑکے نے کہا "مولانا! میں نے کل آپ کو خواب میں دیکھا"۔ مولانا فوراً بولے ___ "تو میاں! خواب میں میری صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ بچے تو خاص طور پر ڈر جاتے ہیں"

اور اُن کی یہ باتیں سُن کر کلاس کے طالب علموں سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ دیر تک قہقہے بلند ہوتے رہتے مولانا بھی ہنستے رہے۔

بی۔ اے کی کلاس تو بہت بڑی ہوتی تھی۔ اس لئے مولانا سے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ لیکن جب میں بی۔ اے آنرز اور پھر ام۔ اے کے آخری سال میں پہنچا تو مولانا سے قریب رہنے کے زیادہ مواقع ملے۔ مولانا کی شفقت میں اس زمانے میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے شروع شروع انگریزی ادبیات میں بی۔ اے آنرز لیا تھا لیکن مولانا کے اصرار پر میں انگریزی کو چھوڑ کر اُردو ادبیات میں بی۔ اے آنرز کرنے لگا۔ کیونکہ مولانا نے مجھے ایک دن بیٹھ کر دیر تک یہ سمجھایا تھا کہ اُردو میں بی۔ اے آنرز اور ام۔ اے کرنا زیادہ مفید ہے۔ یہ مضمون ابھی نیا ہے، اور اس میں ملازمت ملنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ انگریزی میں تو بے شمار لوگ بی۔ اے آنرز اور ام۔ اے کر چکے ہیں۔ اس لئے اس میں ملازمت کے لئے امکانات بہت ہی کم ہیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لئے!

یہ بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے اُردو میں بی۔ اے آنرز کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور واقعی مجھے ایسا کرنے سے بہت فائدہ ہوا۔

بی۔ اے آنرز اور ام۔ اے کی کلاسیں چھوٹی ہوتی تھیں۔ سات آٹھ لڑکے ہوتے تھے۔ مولانا ان لڑکوں کو اپنے قریب بٹھا لیتے تھے، اور حسب معمول پہلے کچھ دلچسپ باتیں کرتے تھے، اور لڑکوں کا حال احوال پوچھتے تھے۔ پھر پڑھانا شروع کرتے تھے، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور پڑھاتے تھے۔

ایک دن لیکچر سے پہلے مولانا نے حسبِ معمول سگریٹ سُلگایا اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔

کہنے لگے "میاں! میری تین باتیں ہمیشہ یاد رکھنا — زندگی میں پریشانی نہیں ہوگی۔ ایک تو یہ کہ اپنی سواری (یعنی سائیکل وغیرہ) کبھی کسی کو نہ دینا۔ کیونکہ جب وہ واپس آئے گی تو تمہیں وہ اپنی سائیکل نہیں معلوم ہوگی۔ دوسرے اپنی کتاب کبھی کسی کو نہ دینا۔ کیونکہ اول تو وہ واپس نہیں آئے گی، اور اگر آئے گی تو اُس کا حلیہ بگڑ چکا ہوگا۔ اُس کو ہاتھ میں لینے اور پڑھنے کو تمہارا جی نہیں چاہے گا۔ تیسرے یہ کہ اپنا قلم کبھی کسی کو نہ دینا۔ کیونکہ ہر شخص قلم کو اپنے طریقے سے استعمال کرتا ہے۔ جب وہ قلم تمہیں واپس ملے گا تو تم خود اُس سے لکھ نہیں سکو گے"۔

میں مولانا کی یہ باتیں چُپ چاپ سُنتا رہا۔ باتیں اپنی جگہ صحیح تھیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ ذرا مولانا کا امتحان لینا چاہیئے — لیکچر شروع ہوتے ہی میں مولانا سے اُن کا قلم مانگوں گا۔ چنانچہ جب مولانا کا لیکچر شروع ہوا تو میں نے کہا "مولانا! آج میں اپنا قلم بھول آیا ہوں۔ آپ کے لیکچر کے نوٹس کس طرح لکھوں"؟

مولانا نے فرمایا "میاں! تم لوگ میری بات نہیں مانتے۔ ابھی تو میں نے تم کو یہ نصیحت کی تھی کہ اپنا قلم کبھی کسی کو نہ دینا، اب تم مجھ سے ہی قلم مانگ رہے ہو۔ لیکن مجبوری ہے۔ مجھے یہ بھی خیال ہے کہ تم نوٹس کس طرح لکھو گے۔ بہرحال آج تو میرا قلم لے لو، لیکن آئندہ احتیاط کرنا"۔

یہ کہہ کر مولانا نے اپنا نہایت خوبصورت سُرخ رنگ کا پارکر قلم مجھے دے دیا، اور میں نے اُن کے اس قلم سے نوٹس لکھے۔ اور ایک دفعہ نہیں کئی بار ایسا ہوا۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانے سے مولانا کے قلم پر میری نظر تھی۔ وہ قلم بہت ہی خوبصورت تھا، اور چلتا بھی خوب تھا۔ اس لئے ہر لیکچر میں میں مولانا سے اُن کا قلم مانگنے کی جسارت کرتا تھا۔ اور مولانا بظاہر جزبز ہو کر خندہ

پیشانی سے اپنا قلم مجھے دے دیتے تھے۔
میں یہ سب کچھ شرارت سے کرتا تھا، مولانا جانتے بھی تھے کہ قلم کی اس طلب میں شوخی اور شرارت ہے لیکن اُن کے مزاج میں جو شفقت اور محبت تھی، وہ انہیں مجبور کر دیتی تھی، اور وہ اپنا قلم تو مجھے دے دیتے تھے لیکن ہمیشہ کہتے تھے "تم لوگ بڑے شوخ اور شریر ہو۔ مجھے اپنے اصولوں کو توڑنے کے لئے مجبور کرتے ہو۔ میری باتوں پر نہ تو خود عمل کرتے ہو نہ مجھے ان پر عمل کرنے دیتے ہو۔ بہر حال میرے قلم سے کام کر لو۔ لیکن واپس کر دینا۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں"۔
اور میں اپنے بیشتر نوٹس مولانا کے قلم سے لکھتا تھا۔ آج تک یہ نوٹس میرے پاس محفوظ ہیں۔ شوخی اور شرارت کی بات اور ہے لیکن آج سوچتا ہوں تو مولانا کی تمام باتیں مجھے صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میں مولانا کی طرح مجبوراً، اپنے مزاج کی نرمی کے پیش نظر ان پر عمل نہیں کر پاتا۔
مولانا محمد حسین خاصے مذہبی آدمی تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ یونیورسٹی سے جب وہ گھر جاتے تھے تو اُن کا زیادہ وقت محلّے کی مسجد میں گذرتا تھا۔
اس مذہبیت کے زیر اثر مولانا کبھی کبھی مجھ سے پوچھتے تھے "امان! یہ ترقی پسند ادیب مذہب سے اتنے کیوں برگشتہ ہیں؟ جس کو دیکھو مذہب سے بغاوت کر رہا ہے!"
میں کہتا "یہ سب کچھ صحیح نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ ادب کی ترقی پسند تحریک میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو خاصے مذہبی ہیں"۔
اس پر مولانا فرماتے "معلوم ہوتا ہے تم پر بھی ترقی پسندوں کا اثر ہو رہا ہے۔ کیوں نہ ہو میاں! ما شاء اللہ جوان ہو۔ آزاد خیال ہو۔ اس عمر میں تو

ہر شخص پٹری سے اُتر جاتا ہے۔ گم راہ ہو جاتا ہے۔ میں تمہارے والد صاحب سے ضرور کہوں گا کہ لڑکے کو سنبھال لیجئے۔ یہ ترقی پسندوں میں شامل ہو گیا ہے۔ اور گم راہ ہو رہا ہے۔"

اور میں یہ سُن کر سنجیدگی سے کہتا۔ مولانا! یہ سب کچھ صحیح نہیں ہے۔ والد صاحب سے کچھ نہ کہئے گا۔ وہ مذہبی معاملات میں بہت سخت ہیں۔ اگر آپ نے کچھ کہہ دیا تو خدا جانے وہ میرا کیا حال کریں گے۔ ہو سکتا ہے مجھے گھر سے نکال دیں یا یونیورسٹی آنے سے روک دیں۔"

یہ سُن کر مولانا فرماتے "میاں! میں تو مذاق میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ میں ان سے کچھ نہیں کہوں گا۔ آج کل تو ہر شخص آزاد خیال ہو گیا ہے۔ لوگ مذہب سے برگشتہ ہوتے جاتے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے تو مذہب کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ کیا تم نے "انگارے" کے افسانے پڑھے ہیں۔ اِن میں مذہب کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس قسم کے خیالات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ (AFTER ALL EBADAT YAR KHAN! I AM A RELIGIOUS MAN) بھئی، میں تو مذہبی آدمی ہوں۔ میرے خیالات پُرانے ہیں۔ میں ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔"

اور میں ہمیشہ یہ سُن کر مولانا سے یہ کہتا کہ "مولانا! مذہبی ہونا تو اچھی بات ہے۔ ہم لوگ جو مذہبی ماحول میں پلے بڑھے ہیں، مذہب سے کس طرح برگشتہ ہو سکتے ہیں۔ مذہب اور ترقی پسندی کا آپس میں کوئی بیر نہیں ہے۔ ترقی پسندوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ مذہب کے غلط تصورات اور بعض مذہبی لوگوں کی منافقت کے بارے میں ہے۔

یہ سُن کر مولانا فرماتے۔ "اگر ایسا ہے تو پھر میں بھی ترقی پسند ہوں۔"

غرض مولانا لیکچر شروع کرنے سے قبل تھوڑی دیر اس قسم کی دلچسپ باتیں ضرور کرتے تھے۔ اور ہم سب اُن کی اِن باتوں سے محظوظ ہوتے تھے۔

لیکن مولانا کی یہ باتیں از راہِ تفنن ہوتی تھیں۔ وہ مذہبی ضرور تھے لیکن تنگ نظر نہیں تھے، نوجوانوں کے خیالات کا انہیں علم تھا۔ ترقی پسند تحریک اُس زمانے میں اپنے شباب پر تھی۔ بیشتر طالب علم اس تحریک سے متاثر تھے۔ مولانا اختلافات کے باوجود ان سب پر شفقت فرماتے تھے۔ تعصب اُن میں نام کو نہیں تھا۔ وہ تنگ نظر نہیں تھے بلکہ خاصے روشن خیال تھے۔ بدلتے ہوئے حالات کے نباض اور ہر قسم کے خیالات رکھنے والے طالب علموں کے طرف دار اور بہی خواہ تھے۔

طالب علموں کی مدد کرنا، اُن کے علم میں اضافہ کرنا، اور اُن کی زندگیوں کو سنوارنا اور نکھارنا اُن کا نصب العین تھا۔ وہ بڑی محنت سے طالب علموں کو پڑھاتے تھے، اور اُن کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوں۔ انہیں اچھی ملازمتیں ملیں، اور وہ زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہم کنار ہوں۔

میں نے جب ام۔اے کا امتحان دیا تو مجھے ایک عجیب وغریب تجربہ ہوا۔ میں طالب علم بُرا نہیں تھا۔ میں نے بڑی محنت سے امتحان کی تیاری کی تھی، اور مجھے یقین تھا کہ مجھے ام۔اے میں فرسٹ کلاس ملے گا۔ اس امتحان میں ایک پرچہ بنانے اور جانچنے کے لئے سید شہنشاہ حسین صاحب اُستاد اُردو آئیزابیلا تھوبرن کالج کو دے دیا گیا۔ وہ پہلی دفعہ ام۔اے کے پرچے کے ممتحن مُقرر ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے کئی جگہ شہر میں اس کا ذکر کیا، اور اچھے طالب علموں کے نمبر تک بعض محفلوں میں بتا دیئے۔ میرے بارے میں بعض لوگوں سے کہا کہ انہیں چوالیس نمبر ملے ہیں۔ یہ سُن کر حیران و پریشان ہوا کیونکہ میرا پرچہ بہت اچھا ہوا تھا، اور مجھے یہ توقع تھی کہ کم از کم ۹۰ نمبر مجھے ضرور ملیں گے۔ اس لئے میں نے جب ۴۴ نمبر حاصل کرنے کی بات سُنی تو میں اپنے شفیق اُستاد مولانا محمد حسین صاحب کے ہاں گیا تاکہ انہیں بتا دوں کہ شہنشاہ صاحب کیا غضب ڈھا رہے ہیں۔

مولانا کے ہاں پہنچا۔ اطلاع کروائی۔ معلوم ہوا مولانا سامنے مسجد میں ہیں۔ وہاں اطلاع کروائی تو مولانا فوراً باہر تشریف لے آئے۔ اپنے ڈرائنگ روم میں مجھے بٹھایا۔ میں نے انہیں شہنشاہ صاحب کے پرچے کے بارے میں ساری روداد سُنائی۔

مولانا نے یہ سن کر کہا "میں آج ہی شام کو شہنشاہ حسین کے ہاں جاؤں گا، اور صورت حال معلوم کروں گا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہیں ۴۴ نمبر ملیں۔ تمہیں تو کم از کم ۹۰ نمبر اس پرچے میں ضرور ملنے چاہئیں۔"

یہ کہہ کر مولانا نے مجھے تسلی دی۔ چائے پلائی اور اطمینان دلا کر مجھے رُخصت کیا۔

دوسرے دن میں مولانا کے ہاں پہنچا تو مولانا مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے "میاں! شہنشاہ حسین نے پچاس میں سے نمبر دیئے ہیں۔ اس لئے تمہارے نمبر اس پرچے میں ۸۸ ہیں۔ مجھے اسی کی توقع تھی۔ شہنشاہ حسین صاحب کو تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی آسانی کے خیال سے سو کی جگہ پچاس میں سے نمبر دیئے۔ انہیں ایسا کرنا نہیں چاہیئے تھا۔"

مجھے یہ سُن کر اطمینان ہوا اور میں مولانا سے تھوڑی دیر باتیں کر کے اپنے گھر واپس آیا، اور کئی دن تک یہ سوچتا رہا کہ مولانا اپنے ایک ایک طالب علم کا کس طرح خیال رکھتے ہیں۔ اُن کے مزاج میں طالب علموں کے ساتھ کتنی شفقت اور محبت ہے۔ ایسے اُستاد تو خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

غرض یہ مولانا کی شفقت ہی تھی جس کی وجہ سے میں نے ام۔ اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا، بیشتر ممتحنوں نے میرے پرچوں کی تعریف کی، اور ذاتی طور پر مولانا کو خط لکھے جن میں بعض طالب علموں کے پرچوں کو سراہا۔ اُن میں سے ایک میں بھی تھا۔

یہ تفصیل مولانا نے مجھے خود بتائی۔ وہ کوئی بات صیغۂ راز میں رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ امتحان کے نظام کو غلط سمجھتے تھے، اور اُن کا خیال تھا کہ امتحان

کا نتیجہ تو صرف طالب علموں کے اساتذہ ہی کو تیار کرنا چاہیئے۔ اس معاملے میں اُن کے خیالات انقلابی تھے۔

مولانا محمد حسین عربی، فارسی اور اُردو زبانوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ اُن کا انگریزی ادبیات کا مطالعہ بھی بہت اچھا تھا۔ پڑھاتے تو علم کے دریا بہا دیتے تھے۔ انیس، غالب، حالی اور اقبالؒ کو پڑھاتے ہوتے معنویت کے ایسے ایسے پہلو نکالتے تھے جن کی طرف شاید ان شاعروں کا بھی ذہن نہیں گیا ہوگا۔

تدریس مولانا کا خاص میدان تھا۔ لکھنے لکھانے اور تحقیق و تنقید کے کام سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بُنیادی طور پر ایک اُستاد تھے، اور وہ اپنا زیادہ وقت اپنے طالب علموں کے علم کو بڑھانے، اور اُن کے کردار کو بنانے سنوارنے پر صَرف کرتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔

یہ زمانہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم کے لئے سازگار نہیں تھا۔ یونیورسٹی کو بنے ہوئے ابھی مشکل سے پندرہ سولہ سال ہوئے تھے۔ ارباب اختیار کی زیادہ توجہ سائنس اور انسانی علوم کی طرف تھی۔ بڑے بڑے پروفیسر بنگال سے بُلائے گئے تھے، اور وہ اپنے اپنے شعبوں میں علوم کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ اُن میں سے بیشتر بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ اُن کی تصانیف کا دُنیا کے ہر ملک میں شہرہ تھا۔ پروفیسر سدھانت انگریزی ادبیات کے نامور پروفیسر، ڈاکٹر رادھا کُمُد مکرجی، ڈاکٹر سیو کمار بنرجی اور ڈاکٹر نندلال چیٹرجی تاریخ کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی اور ڈی۔ پی مکرجی معاشیات کے عالم تھے۔ ڈاکٹر مجمدار انتھر پالوجی کے ماہر تھے۔ اور سائنس میں ڈاکٹر چیٹرجی، ڈاکٹر ولی محمد اور ڈاکٹر حسین ظہیر بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پروفیسر تھے۔ اُردو کا شعبۂ فارسی عربی کے ماتحت تھا۔ اس لئے عربی، فارسی اور اُردو کو یونیورسٹی میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ ان زبانوں میں اس وقت کوئی پروفیسر نہیں تھا۔ صرف ریڈر یا لکچرار تھے۔ ہمارے مولانا بھی شعبۂ اُردو میں لکچرار تھے۔ اور اُن کو اُردو کا ریڈر بنانے

کے لئے ارباب اختیار میں سے کوئی توجہ نہیں کرتا تھا۔ مولانا اُس کے شکوہ سنج
تھے، اور اُن کو اس کا بڑا ملال تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُردو کے شعبے میں اگر پروفیسر
نہیں تو کم از کم ایک ریڈر ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ مولانا اس کا ذکر بڑی حسرت سے
کرتے تھے۔

اکثر لیکچر شروع کرنے سے قبل مجھ سے کہتے تھے شعبۂ اُردو میں بھاڑ جھونکتے
ہوئے مجھے پندرہ سال سے زیادہ ہوگئے لیکن مجھے اُردو میں ریڈر نہیں بناتے۔
یہ میرا ذاتی معاملہ بھی ہے لیکن اُردو کا معاملہ بھی ہے کہ لکھنؤ میں اُردو کا کوئی ریڈر
یا پروفیسر نہیں ہے۔ ارباب اختیار کی توجہ اُردو کی طرف نہیں ہے۔ عجب
تماشا ہے"۔

پھر یہ فرماتے تھے۔ (EBADAT YARKHAN! I SHALL DIE A
LECTURE) اور مجھے اُن کی یہ باتیں سُن کر بہت دکھ ہوتا تھا، اور میں کہتا تھا "مولانا!
آپ اپنا دل چھوٹا نہ کیجئے۔ انشاءاللہ آپ یہاں اُردو کے ریڈر بلکہ پروفیسر
بھی ہوں گے"۔

لیکن افسوس ہے کہ مولانا محمد حسین لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے ریڈر یا پروفیسر
نہ ہو سکے۔ جب یونیورسٹی میں اُردو کے ریڈر کی جگہ منظور ہوئی تو اچانک اُن کا
انتقال ہوگیا۔

انتقال سے چند سال قبل وہ بہت افسردہ رہتے تھے۔ کیونکہ اُن کی بیگم
صاحبہ جل کر مرگئی تھیں۔ اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ مولانا کو اس کا بڑا غم
تھا۔ اکثر اپنی بیگم صاحبہ کا ذکر کرتے تھے، اور اُن کے جل کر مرجانے پر آنسو بہاتے
تھے۔ ہر ایک مولانا سے ہمدردی کا اظہار کرتا تھا لیکن بیگم صاحبہ کے انتقال سے
اُن کے دل پر جو زخم کاری لگا تھا، اُس کو مندمل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

فطرت کی اس ستم ظریفی کو کیا کہئے کہ جو شخص اتنا بڑا انسان دوست تھا، اور جس کی شفقت اور محبت ہر ایک کے زخموں پر مرہم رکھتی تھی، وہ خود آخر عمر میں ایسے زخموں کا شکار ہوا جس کے لئے کوئی مرہم کارگر نہیں ہوتا۔
انسان بھی کتنا بے بس اور مجبور محض ہے!

پروفیسر سید احتشام حسین

اُستادِ محترم پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ایک عظیم انسان، ایک مخلص دوست، ایک بہت بڑے عالم، ایک منفرد و دانش ور ایک بلند پایہ ادیب ایک اہم نقاد اور ایک نہایت ہی شفیق اُستاد تھے۔ اُنہوں نے اپنی ساری زندگی محبت اور خدمت کے کاروبار میں گذار دی۔ ہزارہا انسانوں اور خصوصاً طالب علموں کی آبیاری کی، اور انہیں ایک اچھا انسان، علم و دانش کا پرستار اور اعلٰے وارفع تہذیبی وادبی اقدار کا پرستار بنایا۔ اس اعتبار سے وہ بلند مرتبے پر فائز نظر آتے ہیں۔ اُن کی دلنشین و دلآویز شخصیت کی چاندنی آج بھی بے شمار انسانوں اور خصوصاً اُن کے شاگردوں کی زندگیوں میں چھٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُن کی حسین یاد اپنی تمام تر جمال آرائی و زیبائی سے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچی اور زندگی کو دامن باغباں اور کفِ گل فروش بناتی ہے۔

احتشام صاحب عرصہ دراز تک لکھنؤ یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد رہے۔ میں جب ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوتو وہ اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے سینئر لکچرار کی حیثیت سے آئے، اور پھر یہیں اُردو کے ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے۔ انتقال سے چند سال قبل وہ الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو

کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہو گئے تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے دورانِ قیام میں میں اُن سے بہت قریب رہا، اور اُن کی شفقت مجھ پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور یہ کہ وہ صحیح معنوں میں ایک شجر سایہ دار ہیں۔

میں اُس زمانے میں ایک معمولی سا طالب علم تھا لیکن احتشام صاحب نے علم و ادب کے سبزہ زاروں میں ایسی سیر کرائی کہ میں چند سال میں علم و دانش کا پرستار اور ادب و فن کی زلف گرہ گیر کا گرفتار ہو گیا، اور مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوا جیسے وہ انگلی پکڑ کر مجھے علم و ادب کے اِن باغوں، سبزہ زاروں اور گلستانوں کے جمالِ جہاں آرا سے آشنا کر رہے ہیں۔ وہ میرے اُستاد بھی تھے، اور رہبر و رہنما بھی! اُنہوں نے زندگی کے ان گنت حقائق کا شعور میرے اندر پیدا کیا۔ شفقت اور محبت کے آداب مجھے سکھائے۔ انسان دوستی، احترام آدمی، اعلےٰ اخلاقی معیار اور ارفع تہذیبی اقدار کے خیالات سے میرے دل میں شمعیں سی فروزاں کیں۔ دیئے سے روشن کئے، اور میں اُن کی روشنی میں زندگی کی تاریک راہوں پر گام زن ہو کر ان گنت ایسی منزلوں سے ہم کنار ہوا جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہیں۔

آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ سب احتشام صاحب کی بدولت ہے۔ اُنہوں نے اپنے فکر و عمل سے مجھے زندگی کے صحیح معنیٰ سمجھائے۔ محبت اور شفقت کے اسرار و رموز مجھ پر روشن کئے۔ خِدمت کے راز ہائے سربستہ سے مجھے آشنا کیا۔ ادب سے دلچسپی کے چراغ میرے دل میں روشن کئے، خدمت کے راز ہائے سربستہ سے مجھے آشنا کیا۔ ادب سے دلچسپی کے چراغ میرے دل میں روشن کئے، اور علمی ادبی کام کرنے کی ایسی دھن اور لگن میرے اندر پیدا کی کہ میں نے اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ احتشام صاحب کے شاگرد ہونے کی دولت بیش بہا مجھے نصیب نہ ہوتی تو شاید میں آج علم و ادب کا

لوچہ گردنہ ہوتا۔ بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی روش اختیار کرتا، جائیدادوں سے دلچسپی لیتا، مقدمے بازی کرتا، شکار کھیلتا، شطرنج، چونسر اور دلچسپی سے دل بہلاتا کیونکہ سوپشت سے میرے آبا کا پیشہ سپہ گری تھا، اور وہ شجاعت کے اس کاروبار کے ساتھ ایسے ہی کاموں میں اپنا بقیہ وقت گذارتے تھے۔ احتشام صاحب نے میرے اندر ادب کا جو چسکا پیدا کیا، اُس نے میری دُنیا ہی بدل دی۔ یہ ادب ہی کا فیضان تھا کہ میں انسان کو مجبور، ماحول و وراثت کا اسیر، خطا کا پُتلا سمجھنے لگا، اور میرے اندر نفرت، انتقام اور بغض و کینہ کے جذبات سرد پڑنے لگے۔ عفو و درگذر کا خیال میرا شعار بن گیا، اور اس طرح انسانی زندگی کے اَن گنت روپ میں مجھے خوبصورتی نظر آنے لگی۔

احتشام صاحب بڑی ہی جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ سرو قد، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، سُرخ سفید رنگ، دُبلے پتلے لیکن بھرا بھرا صحت مند جسم، جسم پر لکھنوی وضع قطع کی شیروانی، سر پر تعلقہ داران اودھ کی کشتی نما ٹوپی، ہاتھوں میں ایک رجسٹر اور چند کتابیں، ـــ بس اپنے اس مخصوص انداز سے وہ پہچانے جاتے تھے۔ اُن کی اس شخصیت ہی کا یہ اثر تھا کہ اُن کے بعض طالب علم بھی اسی احتشام صاحب کا مخصوص لباس پہننے لگے تھے۔ ویسے اس زمانے میں لکھنؤ کے شرفا کا یہی مخصوص لباس تھا۔ اس لئے مسلمان طالب علموں کو احتشام صاحب کے مخصوص لباس کو اپنانے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔

یہ احتشام حسین صاحب یونیورسٹی میں ابھی نئے نئے آئے تھے۔ عمر بھی ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ مشکل سے تیس بتیس سال کے تھے۔ طالب علموں کے ساتھ اچھی طرح ملتے جُلتے تھے۔ شفقت بھی اُن کے مزاج میں بہت تھی۔ اس لئے طالب علم انہیں گھیرے رہتے تھے۔ لیکچروں کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھتے تھے، تو ایسے طالب علم جن کو ادب کا چسکا تھا، اُن

کے پاس آجاتے تھے، اور اُن سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ دو
کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ احتشام صاحب طالب علموں کو خاصا وقت
دیتے تھے۔ اُن کی رہنمائی کرتے تھے مطالعے کے لئے اہم کتابوں اور مُصنّفوں
کے نام بتاتے تھے۔ اہم ادبی تخلیقات کا تعارف اور تجزیہ بھی کرتے تھے۔ اس
طرح طالب علموں کے علم میں اضافہ ہوتا تھا۔ اُن کے اندر صحیح ذوق ادب کی شمع
بھی فروزاں ہوجاتی تھی اور وہ نہ صرف مطالعۂ ادب بلکہ تخلیق ادب کی طرف بھی
مائل ہوجاتے تھے۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ احتشام صاحب کی
تربیت اور رہنمائی کی بدولت لکھنؤ یونیورسٹی میں شاعر، افسانہ نگار، اور نقاد پیدا
ہونے لگے۔ غرض یہ کہ اُن کی موجودگی سے یونیورسٹی میں خاصا ادبی ماحول پیدا
ہوگیا تھا۔

میں گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ پاس کرکے لکھنؤ یونیورسٹی
آیا تھا۔ جوبلی کالج میں میرے اُستاد، پروفیسر سید علی عباس حسینی، پروفیسر حامداللہ
افسر اور مولانا اختر علی تلہری تھے جن سے میں نے استفادہ کیا تھا۔ یہ بزرگ
اعلےٰ درجے کے ادیب تھے، اور اس زمانے کی ادبی دنیا میں اُن کی بڑی شہرت
تھی۔ اِن اُستادوں نے جو ادبی ذوق اور مطالعے کا شوق پیدا کیا تھا، وہ یونیورسٹی
میں میرے بہت کام آیا۔ اُنہیں کی معرفت احتشام صاحب سے میرا تعارف
ہوا، اور انہیں کی وجہ سے اُنھوں نے مجھے اپنے خاص شاگردوں کے حلقے
میں شامل کرلیا۔ ہمیشہ میری رہنمائی کی، اور اُن کی اس رہنمائی کی بدولت
میرے علم میں اضافہ اور میرے ذوق ادب وشعور میں وزن اور نکھار کی کیفیت
پیدا ہوئی اور میں ادب کا ایک سنجیدہ طالب علم بن گیا۔

اس زمانے میں مجھے نہ صرف اُردو ادب بلکہ عالمی ادبیات کے مطالعے
کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اس کی طرف توجہ دلانے کا سہرا بھی احتشام صاحب
ہی کی رہنمائی اور شفقت و محبت کے سر ہے۔

ہوا یوں کہ جب احتشام صاحب نے ہم لوگوں کو پڑھانا شروع کیا، تو ہم اُن کے لیکچروں سے ہم بہت متاثر ہوئے ۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے شاعروں اور نثر نگاروں کے حالات زندگی، اُن کی شخصیت، تصانیف انداز تحریر اور ادبی مرتبے پر تجزیاتی انداز میں باقاعدہ لیکچر دیتے تھے ۔ اس کے بعد متن کی طرف توجہ کرتے تھے ۔ ان لیکچروں سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا، اور ہمیں لُطف بھی آیا ۔ کیونکہ احتشام صاحب کا خطیبانہ رنگ و آہنگ اور شہد و شکر میں ڈوبا ہوا لہجہ ایسا تھا کہ اُن کی باتیں ہمارے دلوں میں اُتر جاتی تھیں ۔ اور پھر طالب علموں کے ساتھ اُن کا رویہ اتنا محبت آمیز تھا کہ ہم لوگ بہت تھوڑے عرصے میں اُن سے خاصے مانوس ہو گئے، اور کلاس کے بعد بھی خالی وقت میں اُن کے ساتھ ۔ اُن کے کمرے میں بیٹھنے لگے ۔ یہاں گفتگو مختلف ادبی موضوعات پر ہوتی تھی ۔ میں اُن کے سامنے چُپ چاپ بیٹھتا تھا، اور علم و ادب کے اس بحر ذخار کی دلکش اور معلومات افزا باتیں شوق و انہماک سے سُنتا تھا ۔

ابھی اُن کے پاس جاتے ہوئے چند ہفتے ہی گذرے تھے کہ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا "آپ کس کالج سے آئے ہیں؟"

میں نے کہا "میں ابتدائی جماعتوں سے انٹرمیڈیٹ تک گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں پڑھتا رہا ہوں"۔

پھر اُنھوں نے پوچھا "آپ کے اُستاد وہاں کون کون تھے؟"

میں نے کہا "اُردو میں نے پروفیسر حامد اللہ افسر اور مولانا اختر علی تلہری سے پڑھی ہے ۔ میرے انگریزی زبان و ادب کے اُستاد پروفیسر خواجہ اطہر حسین اور پروفیسر اے ۔ پی بینرجی تھے ۔ تاریخ میں نے پروفیسر سید علی عباس حسینی صاحب سے پڑھی ہے ۔ یہ سب میرے شفیق اُستاد تھے، اور ان مضامین سے جو دلچسپی مجھے ہے وہ انہیں اُستادوں کی شفقت اور محبت کی دین

ہے۔میں کئی سال تک اُن کے قدموں میں بیٹھا ہوں، اور میں نے اُن سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔اور اب یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کے قدموں میں زانوئے ادب تہہ کر رہا ہوں"۔

احتشام صاحب نے کہا "یہ تو بڑے پائے کے اساتذہ اور ادیب، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔یقیناً آپ کو اِن کی رہنمائی سے فائدہ ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے آپ ادب سے اتنی دلچسپی لے رہے ہیں"۔

غرض دیر تک احتشام صاحب سے باتیں ہوتی رہیں۔پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "آپ نے اب تک کون کون سے ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ کیا ہے؟

میں نے کہا "ابھی میرا مطالعہ کوئی خاص نہیں ہے۔البتہ میں نے تھوڑا بہت ولی، میر، سودا، میرحسن، جرأت، مصحفی، غالب، مومن وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے، اور نثر نگاروں میں میرامن، غالب، سرسید، حالی، نذیر احمدؒ، شبلی اور آزاد اور سرشار وغیرہ کو پڑھا ہے۔جدید شاعروں میں مجھے علامہ اقبالؒ، جوش ملیح آبادی، مولانا حسرت، جگر صاحب، اصغر گونڈوی جذبی، مجاز اور فیض سے دلچسپی ہے"۔

یہ سُن کر احتشام صاحب نے فرمایا اُردو کے شاعروں اور نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ آپ کو دُنیا کے کچھ نامور ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔مثلاً شیکسپیئر، شیلے، کیٹس، بائرن وغیرہ، فرانسیسی ادیبوں میں آپ بالزاک، فلابیر، موپساں وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔روسی ادیبوں میں پشکن ٹالسٹائے، ترجنیف چیخوف اور گورکی وغیرہ کو پڑھئے۔اِن کے ترجمے انگریزی میں موجود ہیں۔اِن کے مطالعے سے آپ کا ذہن روشن ہوگا، اور ادبی ذوق میں نکھار کی کیفیت پیدا ہوگی"۔

میں نے اُن کی اِن تجاویز کو گرہ میں باندھا، اور اِن مصنفین کی کتابوں کو لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری سے حاصل کر کے اِن کا مطالعہ شروع کر دیا، یونیورسٹی

کے دورانِ قیام میں اُردو کے مصنفین کے مطالعے کے ساتھ بین الاقوامی شہرت کے اِن مصنفوں کا مطالعہ بھی میں نے شوق سے کیا۔ اور اسی سے مجھے بہت فائدہ ہوا"۔

پھر ایک دن احتشام صاحب کہنے لگے "اس وقت دُنیائے ادب میں دو رُجحانات بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو عمرانی یا مارکسی، دوسرے نفسیاتی۔ عمرانی رُجحان کے لئے آپ مارکس، لینن اور گورکی مایا کافسکی، کاڈویل اور رالف فاکس وغیرہ کو پڑھئے اور نفسیاتی رُجحان کے لئے فرائڈ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ابھی اس کے خطبات پڑھ لیجیئے۔ یہ کتاب بظاہر تو نفسیات کی کتاب ہے اور اس کا موضوع لاشعور ہے، لیکن اس میں فرائڈ نے ادب اور ادیبوں کے مطالعے کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے"۔

غرض اس طرح مختلف مُلاقاتوں میں احتشام صاحب میری رہنمائی کرتے رہے، اور یہ اُنھیں کا فیض ہے کہ ادب کے مطالعے کا جذب وجنوں میرے اندر پیدا ہوگیا۔ اس زمانے میں میں نے بہت کچھ پڑھا۔ کچھ سمجھ میں آیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مطالعے کے شوقِ فراواں نے میرے اندر ایک ایسی تبدیلی پیدا کی جس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

میں نے بی۔اے کے پہلے ہی سال میں انگریزی ادبیات میں آنرز لے لیا تھا، اور میں لکھنو یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر سدھانت صاحب، دیا موائے مترا صاحب، رادھے شیام ستوگی صاحب اور ڈاکٹر رام بلاس شرما صاحب سے بھی استفادہ کرتا تھا۔ ان کے لکچروں اور ٹیوٹوریل میں باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا، اور انگریزی ادبیات کے یہ اساتذہ بھی مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ اِن کی شفقت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ انگریزی ادب کے مختلف پہلوؤں پر بھی میں بات کر سکتا تھا۔

لیکن میرے اُردو کے اساتذہ اور خصوصاً احتشام صاحب نے مجھے اُردو وادب میں بی۔اے آنرز کرنے کا مشورہ دیا احتشام صاحب نے کہا کہ "اُردو ادب میں بی۔اے آنرز اور ام۔اے کرنے کا فائدہ ہے۔ کیونکہ ابھی یہ نیا مضموان ہے۔اس میں ام۔اے کرنے کے بعد ملازمت ملنے کا امکان بھی زیادہ ہے۔ ہوسکتا ہے اُردو میں بی۔اے آنرز اور ام۔اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی ہی میں لیکچرار کی جگہ مل جائے"۔

یہ بات میرے دل کو لگی، اور میں نے اُردو وادب میں بی۔اے آنرز اور ام۔اے کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اور اس طرح میں اپنے اُردو کے اساتذہ اور خصوصاً احتشام حسین صاحب سے کچھ اور بھی قریب ہوگیا۔اب میں نے اُن کی نگرانی میں ادبیات کا مطالعہ خاصی تفصیل سے کیا جس کی وجہ سے میرے اندر اعتماد پیدا ہوگیا، اور ادبی موضوعات پر تجزیاتی انداز میں بات کرنے کا سلیقہ مجھے آگیا۔ یہ تنقید سے میری دلچسپی کی ابتدا تھی۔

احتشام صاحب نے اسی زمانے میں مجھے مضامین لکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی۔میں اس زمانے میں اُردو کے رسالے، نگار، ہمایوں، ساقی، نیرنگ خیال اور عالمگیر وغیرہ کا مطالعہ تو باقاعدگی سے کرتا تھا۔لیکن اِن کے لئے کوئی مضمون لکھ کر بھیجنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

ایک دن احتشام صاحب کلاس میں آئے تو اُن کے پاس 'ادبی دنیا' کا ایک شمارہ تھا۔ادبی دنیا اُس زمانے میں بڑے سائز پر شائع ہوتا تھا۔یہ پرچہ اُنھوں نے مجھے دے دیا، اور کہا کہ "اس کو پڑھ کر واپس کردینا۔اس میں میرا مضمون شائع ہوا ہے"۔

میں نے اُن سے یہ پرچہ لیا، اور مضمون، نظمیں اور افسانے یونیورسٹی ہی میں بیٹھ کر پڑھ ڈالے۔ رسالہ مجھے بہت اچھا لگا، اور میرا جی چاہا کہ اس کے لئے مضمون لکھوں۔چنانچہ چند روز میں ایک تنقیدی مضمون میں نے تیار کیا، اور

یہ مضمون احتشام صاحب نے مولانا صلاح الدین احمد کو اڈیٹر ادبی دنیا بھیج دیا۔ دوسرے ہی مہینے وہ مضمون ادبی دنیا میں چھپ گیا، اور مجھے اس کی اشاعت سے خوشی ہوئی۔ احتشام صاحب بھی اس مضمون کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ کیونکہ یہ اُن کی شاگردی کی پہلی ابتدائی کوشش تھی۔ احتشام صاحب نے میری ہمت افزائی کی اور اس ہمت افزائی کی وجہ سے میں نے اس وقت کے ادبی رسائل میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کر دیا۔ یہ سب کچھ احتشام صاحب کا فیض تھا کہ اُنھوں نے بہت تھوڑے عرصے میں مجھے ادیب اور نقاد بنا دیا۔

اس طرح احتشام صاحب نے میرے ادبی ذوق و شوق کی آبیاری کی، اور اُن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں ادب کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہو گیا۔ اس زمانے میں میں نے نہ صرف ادبیات کا مطالعہ کیا بلکہ خود بھی لکھا۔ احتشام صاحب نے مجھے لکھنے کے لئے نئے نئے موضوعات بھی سُجھائے۔ میں نے اِن موضوعات پر مضامین لکھے۔ اور یہ مضامین اس زمانے کے مشہور ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔

میں کوئی پانچ سات سال احتشام صاحب کا شاگرد رہا، اور میں نے فرسٹ کلاس میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز اور ام۔ اے کیا۔ ام۔ اے کرنے کے بعد میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے لیا، اور اُن کی نگرانی میں اُردو تنقید پر تحقیق کا کام شروع کر دیا۔ چند سال کی محنت کے بعد میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر لیا۔ احتشام صاحب کی رہنمائی اور شفقت و محبت مجھے حاصل نہ ہوتی تو اس تحقیقی کام کو میں اتنے تھوڑے عرصے میں مکمّل نہ کر پاتا۔

احتشام حسین صاحب اپنے زمانے کے مشہور ادیب اور نامور نقاد تھے ادبی دُنیا میں اُن کی بڑی شہرت تھی۔ اس وقت کے تقریباً تمام اہم ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے اُن کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اور وہ سب اُن کی تنقیدی تحریروں کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن

کے ہاں ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ از راہ نوازش وہ ادیبوں اور شاعروں کی اِن محفلوں میں مجھے بھی شریک کر لیتے تھے۔ چنانچہ ان ادیبوں اور شاعروں سے میری ملاقات بھی احتشام صاحب ہی کے توسط سے ہوئی۔ جن ادیبوں اور شاعروں سے احتشام نے ملاقات کروائی ان میں مولانا حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، جگر مُراد آبادی، احسان دانش، فراق صاحب، اثر صاحب، روش صدیقی، فیض احمد فیض، ساغر نظامی، مخدوم محیٔ الدین، مجروح سُلطان پوری، سلام مچھلی شہری، سید سجاد ظہیر، سید سبطِ حسن، رشید جہاں، پروفیسر سید اعجاز حسین، ڈاکٹر حفیظ، سید رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں ایسے بلند پایہ اور نامور شاعروں اور ادیبوں کی محفلوں میں شریک ہو سکوں گا، اور وہ میرے ایسے نو وارد اور مبتدی شخص پر شفقت فرمائیں گے۔ احتشام صاحب نے اس کے لئے مواقع فراہم کئے، اور اُن سب نے بڑی محبت سے مجھے اپنے قبیلے کا آدمی تصوّر کیا۔

احتشام صاحب اُس زمانے میں لکھنؤ کے محلے باردخانہ دگولہ گنج میں رہتے تھے۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے کے حِصّے میں احتشام صاحب کی اسٹڈی تھی جہاں وہ لکھتے پڑھتے تھے۔ اس حصّے میں دو کمرے مہمانوں کے لئے مخصوص تھے۔ اوپر کی منزل میں اُن کی بیگم اور بچوّں کا قیام تھا۔ اُن کی بیگم پردہ کرتی تھیں۔ اس لئے کبھی نیچے نہیں آتی تھیں۔ البتہ اُن کے بچے اکثر نیچے ہی کے کمروں میں نظر آتے تھے اور ایسا ہنگامہ برپا کرتے تھے کہ اکثر اوقات بیٹھنا اور بات کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں جب احتشام صاحب سے ملنے کے لئے جاتا تھا تو وہ ضرور نیچے آ جاتے تھے۔ کبھی احتشام صاحب کی گود میں بیٹھ جاتے تھے، کبھی میرے پاس آ جاتے تھے۔ کبھی برابر کے کمرے میں کھیلنا شروع کر دیتے لیکن احتشام صاحب نے کبھی اُن سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بچوں پر سختی

کرنے اور اُن کو سرزنش کرنے کے قائل نہیں تھے۔ برخلاف اس کے وہ اُن کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے اور اُن کی ہر فرمائش پوری کر دیتے تھے۔ مہمانوں کا یہ حال تھا کہ نیچے کے دونوں کمرے مہمانوں سے بھرے رہتے تھے۔ بعض مہمانوں کا قیام تو وہاں مستقل طور پر تھا۔ بعض اُن کے وطن سے آتے تھے اور مہینوں لکھنؤ میں احتشام صاحب کے ہاں قیام کرتے تھے۔ یہ سب اُن کے عزیز اور رشتے دار تھے، اور احتشام ان کی بھی ہر فرمائش کو پورا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔

میں اُن کا شاگرد تھا لیکن میں جب بھی اُن کے ہاں ملنے کے لئے جاتا تھا تو وہ اپنے چھوٹے بھائی جنا میاں سے کہتے تھے۔ "جنا! ذرا چائے کے لئے کہہ دینا" اور وہ چند منٹ میں چائے لے آتے تھے" احتشام صاحب چائے تو پی لیتے تھے لیکن نہ پان کھاتے نہ سگریٹ پیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کبھی کبھی پان کھا لیتا ہوں، بلکہ اس بات کا بھی انہیں علم تھا کہ میں اور میرے کلاس فیلو ڈُلارے لال ماتھر، اپنے استاد مسعود صاحب کی ڈبیا میں سے پان چُرا کر کھاتے ہیں۔ اس لئے وہ چائے کے بعد ہمیشہ کہتے تھے "جنا! پان بھی منگوانا" چنانچہ تھوڑی دیر میں پانوں کا خاص دان بھی آجاتا تھا، اور میں ہمت کر کے ایک دو پان کھا لیتا تھا۔

غرض احتشام صاحب کے ہاں خاصی خاطر تواضع ہوتی تھی، باتیں بھی وہ خوب کرتے تھے اور میں اُن کی باتیں سُنتا تھا خود کم بولتا تھا۔ مقصد تو اُن باتوں سے علمی استفادہ اور بعض مسائل کو حل کرنا ہوتا تھا۔ احتشام صاحب کبھی باتیں کرتے ہوئے تھکتے نہیں تھے، اور نہ کبھی بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ نہ کبھی یہ سوچتے تھے کہ اُن کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ زیادہ تر وہ علمی ادبی باتیں کرتے تھے۔ درمیان میں اُن کے بچے، مہمان اور دوسرے لوگ بھی آتے رہتے تھے۔ احتشام صاحب ان سب کے ساتھ

شفقت سے پیش آتے تھے اور بیٹھے بیٹھے اُن کی فرمائشیں پوری کرتے رہتے تھے۔ کوئی فقیر باہر آواز لگاتا تھا تو باہر جا کر اُسے بھی کچھ دے دیتے تھے۔ اُن کے دروازے سے کوئی فقیر کبھی مایوس واپس نہیں گیا۔ احتشام صاحب کے مزاج بڑی دل سوزی تھی۔ وہ کسی کو محروم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر ایک کی خواہش کو پورا کرنا اُن کا نصب العین تھا۔ وہ اس کو ایک طرح کی عبادت سمجھتے تھے۔

احتشام صاحب کے دل میں وہ کیفیت بدرجہ اتم تھی جس کو ورڈسوتھ نے MILK OF HUMAN KINDNESS کہا ہے۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی لئے ہر ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، اور بعض اوقات تو لوگوں کی ضرورت کو پورا کرنے میں وہ اپنے حدود سے تجاوز کر جاتے تھے، باہر نکل جاتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک واقعے کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

میرے ایک ساتھی ایک امتحان میں دو تین سال فیل ہوئے۔ تیسری دفعہ جب اُنہوں نے امتحان دیا تو ایک پرچہ پھر خراب ہو گیا۔ اُنہوں نے جب مجھے بتایا کہ اُن کا ایک پرچہ پھر خراب ہو گیا ہے، اور اگر وہ اس سال پاس نہیں ہوں گے تو تعلیم کو خیرباد کہہ دیں گے تو میں نے صورت حال کی سنگینی کے پیش نظر یہ سوچا کہ احتشام صاحب سے مشورہ کرنا چاہیئے۔

چنانچہ میں اُنہیں احتشام صاحب کے پاس لے گیا۔ ساری روداد انہیں سنائی۔ اُن کا دل بھر آیا، اور اُنہوں نے ایک ذاتی خط ممتحن کو لکھ دیا۔ اُن کے اس خط کا اثر ہوا، اور اُنہوں نے میرے دوست کے ساتھ رعایت کی، اور وہ پاس ہو گئے، اور پھر بہت ترقی کی یہاں تک کہ آج وطن عزیز کی اہم شخصیات میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ احتشام صاحب امتحان کو ایک غلط نظام سمجھتے تھے، اور

اُن کا خیال تھا کہ امتحان کسی کی قابلیت کا اندازہ لگانے کا صحیح معیار نہیں ہوتا پھر ممتحنوں کے جانچنے کے معیار بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے چند نمبروں کے اضافے سے اگر کسی کی زندگی بنتی اور سدھرتی ہے تو ممتحنوں کو یہ رعایت کر دینی چاہیئے۔ اس خیال سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی تہہ میں جو جذبہ اور نظریہ کارفرما ہے، اُس کی اہمیت سے اختلاف کرنا ممکن نہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا احتشام صاحب بڑے ہی رحم دل اور انسان دوست آدمی تھے۔ کسی کی تکلیف اور پریشانی اُن سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں، ہر ایک کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ متعلقین کا خیال رکھنا۔ ایسے لوگوں کو تلاش کر کے اُن کی خدمت کرنا جو ضرورت مند ہوں، طالب علموں کے حالات کو معلوم کر کے اُن کے مسائل کو حل کرنا، کوئی بیمار ہو جائے تو اُس کی جائے قیام پر جا کر اُس کی عیادت کرنا، امتحانات میں سختی کی بجائے نرمی برتنا، کوئی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو تو اس کی حوصلہ افزائی کرنا احتشام صاحب کی شخصیت کے نمایاں ترین اوصاف تھے۔ اُن کی شخصیت میں فرشتوں کی سی خصوصیات تھیں، اور مجھے تو واقعی وہ اپنے فکر و عمل سے ایک فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔

روایت پسندی اور وضع داری اُن کی شخصیت کا لازمی جُز تھی۔ اُنہوں نے مشرقی یوپی ضلع اعظم گڑھ کے ایک مردم خیز قصبے ماہُل میں آنکھ کھولی۔ یہیں کے مدرسوں اور اسکولوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ الہ آباد چلے گئے اور الہ آباد یونیورسٹی سے اُنہوں نے فرسٹ کلاس میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی کی شفقت انہیں حاصل رہی۔ اور اس طرح وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں اُستاد ہو گئے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔

وضع داری، روایت پسندی، بلند اخلاقی، انسان دوستی، پیار محبت یہ خصوصیات انہیں اسی ماحول سے ملیں۔ پھر انہوں نے پڑھ لکھ کر اس وضع داری کو جدید علوم اور طرز فکر کے ساتھ اس طرح شیر و شکر کیا کہ وہ ایک منفرد شخصیت کے مالک بن گئے۔

احتشام صاحب نے اپنی زندگی میں زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ انگریزوں کے دورِ غلامی کی کساد بازاری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے افلاس کو نہ صرف دیکھا بلکہ خود اس میں سے ہو کر گذرے۔ اس صورت حال نے اُن کے اندر رحم دلی، دل سوزی اور فرض شناسی کی خصوصیات پیدا کیں، اور یہ خصوصیات ایسی ہیں جو ایک اُستاد کو مثالی اُستاد بنا دیتی ہیں احتشام صاحب ایک مثالی اُستاد اور ایک مثالی انسان تھے۔

اپنے طالب علموں کی زندگی کو بنانے سنوارنے اور نکھارنے کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ عجب عجب طرح اُن کی مدد کرتے تھے۔ ایک صاحب کسی دور افتادہ جگہ سے لکھنؤ آئے، اور اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا ارادہ کیا۔ احتشام صاحب سے ملے۔ اُنہوں نے ہمت افزائی کی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ کروا دیا۔ موضوع طے ہو گیا لیکن جب کام کرنے کا وقت آیا تو احتشام صاحب کو علم ہوا کہ انہیں کام کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ ادب سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں رکھتے۔ سال دو سال مطالعہ بھی برائے نام ہے۔ سال دو سال تک کچھ نہ کر سکے۔ یہ دیکھ کر احتشام صاحب نے تھیسس کے کئی باب انہیں DICTATE کروا دیئے، اور اس طرح تین سال کی مقررہ مدت میں اُن کا تھیسس تیار ہو گیا، اور اُنہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ احتشام صاحب نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ یہ داخلہ اُن کی سفارش پر ہوا تھا، اور یہ کہ وہ اسکالر کے ساتھ ہمدردی

رکھتے تھے ۔لوگوں سے کام لینا اور خود کام کرنا اُنھیں خوب آتا تھا۔
احتشام صاحب زبان، ادب، فلسفے ونفسیات اور عمرانیات وجمالیات کے ماہر تھے ۔اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔اس لئے انہیں اس طرح کے کاموں میں کوئی دُشواری پیش نہیں آتی تھی۔ان موضوعات پر وہ گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے۔اُن کا مزاج تجزیاتی تھا۔اس لئے وہ فوراً ان علوم کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔مزاج میں باقاعدگی اور ترتیب وتہذیب کا ایسا شعور تھا کہ وہ ہر موضوع کو اظہار وابلاغ کا شاہکار بنادیتے تھے۔یہ تمام پہلو اُن کی تحریر وتقریر دونوں میں اپنا جلوہ دکھاتے تھے۔
احتشام صاحب نے اپنی ساری زندگی ادب کے مطالعے اور اس کی تخلیق میں گذار دی۔ وہ ایک اعلےٰ درجے کے شاعر، ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور ایک منفرد ادیب ونقاد تھے۔اُنھوں نے اُردو تنقید کو ایک نئے رنگ سے آشنا کیا، اور تجزیاتی وعمرانی تنقید کی ایسی داغ بیل ڈالی جو اپنی مثال آپ ہے۔ وہ اُردو میں مارکسی تنقید کے بہت بڑے علم بردار تھے۔اُنھوں نے تنقیدی موضوعات پر ہزار ہا صفحات لکھے۔اُن کا انداز تنقید نہایت عالمانہ اور تجزیاتی تھا۔اس میں سنجیدگی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس کے مطالعے سے ادبی مسائل کو سمجھنے کا شعور بیدار ہوتا ہے، اور وہ پڑھنے والے کو گرمی اور روشنی سے ہم کنار کرتی ہے۔
ویسے احتشام صاحب کا مزاج بُنیادی طور پر تخلیقی تھا۔ وہ اعلےٰ درجے کے شاعر بھی تھے، اور اپنا خوبصورت کلام ایسے ترنم سے پڑھتے تھے کہ سماں بندھ جاتا تھا، اور سامعین اُن کے کلام کو سُن کر مسحور ہوجاتے تھے۔ افسانے بھی اُنھوں نے ایسے لکھے ہیں جن کو اُردو کے بہترین افسانوں کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔اُن کی شاعری کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا

لیکن جو کلام مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوا ہے وہ تخلیق جمال کا شاہکار اور تہذیب جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اُن کی زبان سے مخصوص ترنّم کے ساتھ جو اشعار میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سُنے تھے وہ آج بھی میرے اندر دھومیں سی مچاتے ہیں۔ دو غزلوں کے صرف دو شعر یاد رہ گئے ہیں کیا خوب اشعار ہیں ؎

جب حریم دِل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

کل تو خیر، اُن کی یاد آئی تھی
آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس

یہ اور بات ہے کہ احتشام صاحب کی تنقید کے گھنے اور تناور درخت نے اُن کی شاعری اور افسانہ نگاری کو پوری طرح پھلنے پھولنے نہیں دیا، اور وہ بُنیادی طور پر ایک نقاد ہی رہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ایک عظیم اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت بڑے ماہر لسانیات اور ایک بہت بڑے محقق اور نقاد تھے۔ لیکن انہیں اپنی اس بڑائی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ وہ طالب علموں کی طرح رہتے تھے۔ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ نمود و نمائش سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سخت زندگی گذارتے تھے۔ لوگوں کی خِدمت کرتے تھے، ہر ایک کا دل ہاتھ میں لیتے تھے۔ محبت اُن کا نصب العین تھا۔ لکھنے پڑھنے اور علمی ادبی کام کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ بس یہی اُن کی تفریح تھی۔ وہ کم آمیز تھے لیکن اچھے لوگوں سے اچھی طرح مِلتے تھے۔ یونیورسٹی میں اُن کے احباب کا ایک حلقہ تھا، اور یہ لوگ بین الاقوامی شہرت کے عالم اور کردار کے لوگ

تھے۔ شام کو ان کا معمول یہ تھا کہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جانے کی بجائے کتابوں کی دو کانوں میں نظر آتے تھے۔

احتشام صاحب کے مزاج میں قلندری اور درویشی تھی۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو دولت، شہرت، آرام طلبی سب سے بے نیاز کر لیا تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لہو و لعب سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنے گھر میں نمود و نمائش کے لئے کبھی کوئی ڈرائنگ روم نہیں بنایا۔ کبھی کار نہیں خریدی، نہ کبھی کار رکھنے کا ارادہ کیا۔ وہ سائیکل یا تانگے پر یونیورسٹی جاتے تھے۔ شام کو باہر نکلتے تھے تو عام طور پر پیدل چلتے تھے۔ وہ کبھی کسی کلب کے ممبر نہیں ہوئے۔ کبھی لکھنؤ کے دوران قیام میں سوٹ نہیں پہنا۔ جب راک فیلر اسکالر کی حیثیت سے امریکہ گئے تو البتہ انہیں سوٹ پہننا پڑا۔ لیکن وطن واپس آکر انھوں نے سوٹ کو خیر باد کہہ دیا۔ اُن کے پاس اپنے مکان میں صرف ایک کمرہ تھا جس کو اُن کی اسٹڈی یا مطالعے کا کمرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک میز اور چند کرسیاں اور کتابوں کی کچھ الماریاں تھیں۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر وہ کام کرتے، لکھتے پڑھتے اور لوگوں سے ملتے تھے۔

دِلّی کے دوران قیام میں ایک دفعہ احتشام صاحب نے مجھے میزبانی کا شرف بخشا۔ میں اس زمانے میں اینگلو عربک کالج ہوسٹل کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ احتشام صاحب اسی کمرے میں میرے ساتھ ٹھہرے۔ اور دِلّی میں جہاں بھی جانا پڑا کرائے کی سواری میں میرے ساتھ گئے۔ لکھنؤ واپس جانے لگے تو میں نے بھی اُن کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا لیا، اور اُنھوں نے بغیر ریزرویشن کے میرے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کیا۔ انہیں اس طرح سفر کرنے میں تکلیف بھی ہوئی لیکن اُنھوں نے میری خاطر اس تکلیف کو برداشت کر لیا۔

ایک دفعہ ہم لوگ اُردو کانفرنس میں شرکت کے لئے ناگپور گئے۔ اُنہوں نے میرے ساتھ انٹرکلاس میں سفر کیا۔ لکھنؤ سے جھانسی پہنچے۔ رات کو دو بجے گاڑی بدلی، ناگپور کی گاڑی دو بجے رات کے وقت جھانسی کے اسٹیشن پر آئی۔ ریل کا ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ ہم لوگ کھڑکیوں میں سے اندر داخل ہوئے۔ اُس ڈبے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی صاحب اور ڈاکٹر ابوالليث صدیقی بھی ناگپور جا رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں جگہ دی اور ہم اس طرح رات بھر جاگتے ہوئے ناگپور پہنچے، اور کانفرنس میں شرکت کرکے اسی طرح لکھنؤ واپس آئے۔

احتشام صاحب کے احسانات مجھ پر بے شمار ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پڑھایا۔ ادب کا ذوق اور مطالعے کا شوق میرے اندر پیدا کیا، اور مجھے اپنی رہنمائی سے ادیبوں اور نقادوں کی صف میں میرے لئے جگہ بنا دی۔ امریکہ گئے تو وہاں سے مجھے لمبے لمبے خط لکھے، جن سے امریکہ کی یونیورسٹیوں اور وہاں کے ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں اور تعلیم و تدریس کے ماہروں کے بارے میں میری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد جب میں نے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے رختِ سفر باندھا تو نہ صرف میری ہمت افزائی کی بلکہ اپنے احباب مثلاً سید سعید جعفری صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور، ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی صاحب ظفر الاحسن صاحب، فضل احمد کریم فضلی صاحب اور کئی ایسے احباب کو تعارفی خط لکھے جو پاکستان میں اس وقت اعلےٰ عہدوں پر فائز تھے۔ احتشام صاحب کی بدولت مجھے اِن بزرگوں اور دوستوں کی شفقت اور محبت بھی نصیب ہوئی جس کی بدولت پاکستان میں نئی زندگی کے بہت سے مراحل خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو گئے۔

آج احتشام صاحب اس دُنیا میں نہیں ہیں، لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اُن کی عظیم شخصیت میرے اوپر سایہ کئے ہوئے ہے، اور میں اُس کی اَن گنت خصوصیات کے سائے میں زندگی کی پُرپیچ اور دُشوار گذار راہوں پر سکون و اطمینان کے ساتھ گام زن ہوں۔ اُن کے ساتھ جو وقت میں نے گذارا ہے، اُن کے قدموں میں رہ کر جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے، جو کچھ اُن سے سیکھا ہے، اُس کی گرمی اور روشنی آج بھی میری رہنمائی کرتی ہے، اور اس رہنمائی کی بدولت زندگی کی اَن گنت نئی منزلوں سے ہم کنار ہونے کا شوقِ فراواں میرے اندر جذب و جنوں کے طوفانوں کو موج زن کرتا، اور مجھے اونچے سُروں میں یہ نغمہ سناتا ہے جس کے بول ہیں ؎

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

جسٹس ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمن

ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمن ایک عظیم انسان، ایک قابل افسر، ایک باوقار جج، علم و ادب کے ایک پرستار، ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے۔ اپنی منصبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ وہ اپنا زیادہ وقت علم و ادب کے مطالعے میں گذارتے تھے۔ اُن کا مطالعہ وسیع تھا۔ انہیں قدیم اور جدید ادب دونوں سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ادیب نواز بھی تھے، اور ہر ادیب کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اُن کا خاصا وقت ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ گذرتا تھا۔ مشاعروں کی صدارت بڑے شوق سے کرتے تھے۔ ادبی جلسوں میں باقاعدگی سے آتے تھے۔ ادیبوں کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ تعلیم سے بھی انہیں لگاؤ تھا۔ یونیورسٹی کے معاملات و مسائل کو سلجھانے میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ خصوصاً تحقیق کا جو کام یونیورسٹی میں ہوتا تھا، اُس میں اُنہیں گہری دلچسپی تھی۔

پاکستان آنے سے قبل میں نے اُن کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ دِلّی میں بخاری صاحب، تاثیر صاحب، فیض صاحب، مولانا حامد علی خاں صاحب اور حمید احمد خاں صاحب وغیرہ سے جب بھی مُلاقات ہوتی تھی تو

رحمٰن صاحب کی علم دوستی اور ادب نوازی کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ اور اس طرح میرے ساتھ اُن کا غائبانہ تعارف قیام پاکستان سے قبل ہی ہو چکا تھا، اور وہ میرے لئے ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ جب میں تقسیم کے بعد پاکستان آیا تو اُن سے باقاعدہ تعارف ہوا، اور جو کچھ میں نے اُن کے بارے میں سُنا تھا، انہیں ویسا ہی پایا۔

میں نے پہلی بار اُنہیں الحمرا آرٹ کونسل کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ اس جلسے کی صدارت کے لئے آئے تھے۔ جلسے سے قبل یہیں اُن سے میری پہلی مُلاقات ہوئی۔ بڑی محبت اور تپاک سے مِلے۔ حال احوال پوچھا۔ دِلّی کے حالات دریافت کیئے، اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے بارے میں مجھ سے باتیں کیں، اور آخر میں یہ کہہ کر جلسے کی صدارت کرنے کے لئے چلے گئے کہ "اب تو آپ لاہور میں ہیں۔ انشاءاللہ ملاقات ہوتی رہے گی۔ اورینٹل کالج اور یونیورسٹی میں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے بتائیے گا۔"

چند لمحوں کی اس مُلاقات ہی میں میں نے یہ محسوس کیا کہ رحمٰن صاحب نہایت مہذّب، شائستہ، انسان دوست اور محبت والے آدمی ہیں۔ وہ آئی۔سی۔ایس تھے۔ بہت بڑے افسر تھے لیکن اُن کی شخصیت میں افسریت کا شائبہ تک میں نے نہیں دیکھا۔ وہ مختلف محفلوں میں ایک ایک ادیب اور شاعر سے برابری کی سطح پر بے تکلّفی سے باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ بذلہ سنجی کا رنگ بھی اُن کی باتوں میں خاصا تھا۔ مجھے اُن کے اس انداز اور روّیے نے بھی بہت مُتاثر کیا۔

پھر کم و بیش اسی زمانے میں رحمٰن صاحب عارضی طور پر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ یہ جگہ یونیورسٹی کے مُستقل وائس چانسلر ڈاکٹر عُمر حیات ملک صاحب کے انڈونیشیا میں سفیر ہو کر چلے جانے کی وجہ سے خالی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ملک ہی نے مجھے "آفر" بھیج کر پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ

اُردو میں بُلایا تھا۔ وہ میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔اُن کے اتنی جلدی یونیورسٹی سے چلے جانے کا مجھے افسوس ہوا ـــ لیکن رحمٰن صاحب نے مجھے اس کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ وہ میرے لئے ڈاکٹر ملک نے بھی زیادہ شفیق وائس چانسلر ثابت ہوئے۔

اس زمانے میں صرف دو ایک بار ہی اُن سے میری مُلاقات ہوئی۔ وہ بہت مصروف انسان تھے۔لیکن اُنہوں نے مجھے خاصا وقت دیا، اور بڑی محبت سے میرے مستقبل کے بارے میں باتیں کیں۔ یہ باتیں زیادہ تر میرے ادبی کام کے بارے میں تھیں۔میرے مضامین جو اس زمانے کے اہم ادبی رسائل میں شائع ہوئے تھے وہ رحمٰن صاحب نے پڑھے تھے۔انہوں نے ہمیشہ ان مضامین پر اچھے الفاظ میں تبصرہ کیا، اور اس طرح اُن کی مشفقانہ باتوں سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ رحمٰن صاحب کی شفقت تھی کہ اُنہوں نے اِن مضامین کو پسند فرمایا ورنہ اُن میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو ابھی نیا نیا قائم ہوا تھا۔اورینٹل کالج میں یونیورسٹی کے تین شعبے تھے۔عربی، فارسی اور اُردو۔ ان میں ام۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس کے ساتھ کچھ مشرقی علوم کی جماعتیں بھی تھیں، مولوی فاضل، منشی فاضل اور ادیب فاضل وغیرہ۔میں شعبۂ اُردو میں سینئر لکچرار کی حیثیت سے آیا تھا۔لیکن ابھی چند مہینے ہی گذرے تھے کہ کالج کے ارباب اختیار نے یہ موقف اختیار کیا کہ میری پوسٹ ادیب فاضل کو پڑھانے کے لئے ہے۔ میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔چنانچہ ایک مُلاقات میں رحمٰن صاحب سے اس کا ذکر کیا۔

رحمٰن صاحب نے میری باتیں سُن کر فرمایا "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔آپ کو ہم نے اتنی دور سے صرف اس لئے تو آفر بھیج کر نہیں بُلایا کہ آپ صرف ادیب فاضل کو پڑھائیں۔آپ کو تو یونیورسٹی نے ام۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کے کام

کے لئے بُلایا ہے۔ میں اس معاملے میں فیصلہ کر دوں گا۔ چنانچہ اُنہوں نے دوسرے ہی دن ایک مفصّل نوٹ لکھ کر اس معاملے کو ختم کر دیا۔ اور اس طرح میری پریشانی دور ہو گئی۔

چند روز کے بعد میاں بشیر احمد صاحب مدیر ہمایوں کے ہاں کسی دعوت میں اُن سے ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے اس کی تفصیل مجھے سنائی، اور کہا کہ اُس اُلجھن کو میں نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ اب آپ اطمینان سے کام کیجیئے۔ اور جب کبھی کوئی مسئلہ ہو تو بے تکلفی سے میرے پاس آیئے۔ ۴۔ لارنس روڈ پر میرا قیام ہے۔ آپ شام کو کسی وقت بھی میرے پاس آسکتے ہیں"۔

اس کے بعد کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں ہوا لیکن میں کئی بار اُن سے ملنے کے لئے شام کے وقت اُن کی جائے قیام پر گیا۔ اُن سے اِن ملاقاتوں میں زیادہ تر ادبی موضوعات، اور خصوصاً مستقبل کے ادبی منصوبوں پر باتیں ہوئیں۔ اِن ملاقاتوں میں اُن کی باتوں سے میرے اندر اعتماد پیدا ہوا، اور میں اطمینان سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ سال میں ایک دو کتابیں شائع ہونے لگیں۔ رحمٰن صاحب اِن کتابوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور ہمیشہ میری ہمت افزائی فرماتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی کے دورانِ قیام میں اُن کی اس شفقت اور محبت کی بدولت ہی میں اُردو کا پروفیسر اور اورینٹل کالج کا پرنسپل ہوا، اور میں نے ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ علمی ادبی کام بھی کیا۔

رحمٰن صاحب علمی ادبی مزاج کے انسان تھے، اور اُستادوں کے علمی ادبی کام کو دیکھ کر مسترت کا اظہار کرتے تھے۔ اورینٹل کالج میں اکثر تشریف لاتے تھے، اور ایک ایک اُستاد سے اُس کے علمی کام کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔ اورینٹل کالج میں علمی ادبی کام کرنے کی روایت بہت پُرانی تھی۔ اس لئے اُن کا

خیال تھا کہ اس روایت کو برقرار رکھنا چاہیئے، اور اس روایت کو کالج کے اساتذہ اپنے ادبی علمی کاموں ہی سے برقرار رکھ سکتے ہیں۔

رحمٰن صاحب اساتذہ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ یونیورسٹی کا کوئی اُستاد بھی اُن کے پاس کسی وقت بھی جا سکتا تھا۔ وہ ان اساتذہ کی بات سنتے تھے، اور ہمدردی کے ساتھ اُن کے مسائل کو حل کرتے تھے۔ اُن کے پاس سے کوئی مایوس اور ناکام واپس نہیں جاتا تھا۔

یونیورسٹی کے قانون کے مطابق کسی بڑی پوسٹ کو حاصل کرنے کے لئے یونیورسٹی کے اساتذہ کو انٹرویو کے لئے بورڈ کے سامنے پیش ہونا ضروری ہوتا تھا۔ رحمٰن صاحب اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ اُستاد کے عظیم منصب کی توہین کے مترادف تھا۔ لیکن یونیورسٹی کے قانون کی وجہ سے رحمٰن صاحب طوعاً کرہاً اس کو گوارا کر لیتے تھے۔

ایک دفعہ مجھے خود اس کا تجربہ ہوا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں میں نے کسی پوسٹ کے لئے درخواست دی۔ اس کے لئے انٹرویو ضروری تھا۔ لیکن جب میں انٹرویو کے لئے سنڈیکیٹ روم میں داخل ہوا تو رحمٰن صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا "ڈاکٹر صاحب! ہم تو آپ کو جانتے ہیں۔ آپ کو انٹرویو کرنے کی ضرورت نہیں۔ قانون کے مطابق خانہ پُری ہو گئی۔ آپ آ گئے بس اتنا ہی کافی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ، اور زحمت کے لئے معذرت"۔

ایسی باتیں کسی اُمیدوار سے رحمٰن صاحب ہی کر سکتے تھے۔ تہذیب و شائستگی اُن کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اساتذہ کا احترام اُن کے نزدیک ضروری تھا۔ اس لئے وہ اساتذہ کے معاملے میں اس طرح کی رسمی باتوں کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کا احترام کرنے والے میں نے صرف تین وائس چانسلر اپنی تعلیمی زندگی میں دیکھے۔ ایک تو لکھنؤ

یونیورسٹی کے وائس چانسلر اچاریہ نریندر دیو، دوسرے دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر مارس گوائر اور تیسرے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر ڈاکٹر جسٹس ایس-اے رحمٰن!

رحمٰن صاحب نہایت نیک اور شریف انسان تھے-اپنے جاہ و منصب کا احساس، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا لئے دیئے رہنے والا انداز تکبّر اُن میں نام کو نہ تھا شرم و حیا اُن کی شخصیت کا زیور تھی- وہ کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتے تھے اُن کی نظریں ہمیشہ نیچی رہتی تھیں-اپنے ماتحتوں تک سے وہ بے باکی کے ساتھ باتیں نہیں کرتے تھے-اور اساتذہ کے سامنے تو وہ صرف اُن کے ایک رفیق کار معلوم ہوتے تھے-میں نے کبھی اُن کو کسی کے ساتھ سختی سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا-وہ کبھی کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے نظر نہیں آئے-اگر کبھی کسی سے اختلاف بھی کرتے تھے تو اُس کا اظہار بہت دھیمے طریقے سے دوستانہ اور خوش گوار انداز میں ہوتا تھا-اس لئے کہ وہ تہذیب، شائستگی اور شرم و حیا کا ایک نمونہ تھے-

میرے ساتھ تو اُن کا رویّہ ہمیشہ ایک بزرگ کا سا تھا- وہ میرے محسن تھے-مجھ پر شفقت فرماتے تھے-میری بات غور اور انہماک سے سُنتے تھے اور میری تجاویز کو ہمیشہ مان لیتے تھے-اُنہوں نے ازراہ کرم مجھے اپنی جائے قیام پر بھی آنے کی اجازت دے رکھی تھی-قیام پاکستان کے فوراً بعد وہ کئی سال تک ۴۰-لارنس روڈ پر رہے-اس کے بعد جب گل برگ میں اُن کی وسیع و عریض کوٹھی تعمیر ہوگئی تو وہ اس میں منتقل ہو گئے-میں اِن دونوں مکانوں میں بارہا حاضر ہوا، اور میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا جیسے میں اپنے گھر میں ہوں-رحمٰن صاحب مجھے ہمیشہ اپنی اسٹڈی میں بٹھاتے تھے-اور کبھی اندر لان میں بیٹھتے تھے اور نہایت مانوس سی فضا میں بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے باتیں کرتے تھے-ان ملاقاتوں میں علمی ادبی باتیں ضرور ہوتی تھیں-وہ ہمیشہ مجھ سے میرے ادبی کاموں

کے بارے میں ضرور دریافت کرتے تھے، اوران کاموں کی تفصیل سُن کرمسرت کا اظہار کرتے تھے جس سے میری ہمت افزائی ہوتی تھی۔

رحمٰن صاحب صرف چند سال یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔لیکن اس زمانے میں یونیورسٹی میں صاف سُتھری فضا پیدا ہوئی۔ ریسرچ کے کئی شعبے قائم ہوئے۔ اساتذہ کے احترام میں اضافہ ہوا، اوراُن کے زمانے میں انتظامیہ سے کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ پھر سنڈیکیٹ کے ایک اہم ممبر کی حیثیت سے اُنہوں نے یونیورسٹی کو مختلف طریقوں سے تعمیر وترقی کے راستوں پر ڈالا، اور ہر منصوبہ اُن کی صدارت اور نگرانی میں تکمیل سے ہم کنار رہوا۔

میری پرنسپلی کے زمانے میں اُنہوں نے اورینٹل کالج کا جشن صدسالہ منانے کا ڈول ڈالا۔اس کا مقصد اورینٹل کالج کی تعلیمی، علمی اوراد بی کاموں کا جائزہ لینا اور دُنیا بھر میں اُس کی خدمات کو متعارف کروانا تھا۔ رحمٰن صاحب نے جشن صدسالہ کمیٹی کی صدارت قبول کی، اور میں نے اُن کے مشوروں سے جشن صدسالہ منانے کا ایک ایسا پروگرام بنایا جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔

شروع شروع میں صرف یہ خیال تھا کہ جشن صدسالہ کے موقع پر کچھ کتابیں شائع کردی جائیں گی، اورایک جلسہ کرلیا جائے گا جن میں کچھ مقالے پڑھوائے جائیں گے۔لیکن جب میں نے جشنِ صدسالہ کے موقع پر ماہرین علوم مشرقی کی ایک بین الاقوامی کانفرنس کا پروگرام بنایا، اور دُنیا کے تمام اہم ملکوں کے پروفیسروں اوراسکالروں کواس میں شرکت کی دعوت دی تو رحمٰن صاحب نے اس کو جشن صدسالہ کے صدر کی حیثیت سے پسند فرمایا، اوراس سلسلے میں میرے جذب وجنوں اور جُرأت رندانہ کی داد دی۔ فنڈ ہمارے پاس نہ ہونے کے برابر تھے۔ رحمٰن صاحب نے اس کے لئے فنڈ زکی فراہمی میں مدد فرمائی۔

جشن صدسالہ کمیٹی کے اجلاس میں کئی بارصدارت کے لئے تشریف لائے۔ نہایت مفید مشورے دیئے۔یہ پروگرام ترتیب دینے میں بھی ہم لوگوں

کو خاصا وقت دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم مشرقی کی یہ بین الاقوامی کانفرنس ۱۹۷۳ء میں بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ ایک ہفتے تک صبح سے شام تک اس کے اجلاس ہوتے رہے، اور امریکہ، روس، انگلستان، جرمنی، فرانس، چیکوسلوویکیہ، سعودی عرب، شام، اُردن، ترکی، ایران، اور افغانستان کے مندوبین نے اُن میں شرکت کی۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمام مندوب اپنے تحقیقی اداروں اور یونیورسیٹیوں کے خرچ پر شرکت کرنے کے لاہور آئے، اور اُن کی وجہ سے لاہور اور اورینٹل کالج میں آٹھ دس دن تک خاصی رونق اور چہل پہل رہی۔

رحمٰن صاحب اپنی بے شمار منصبی مصروفیات کے باوجود اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں اور اس سے متعلق دوسری تقریبات میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے۔ اکثر جلسوں کی اُنہوں نے صدارت فرمائی۔ عشائیوں اور ظہرانوں میں بھی شریک ہوئے، اور افتتاحی اجلاس میں ایک ایسا صدارتی خُطبہ دیا جو اورینٹل کالج کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے۔ اورینٹل کالج کے قیام اور اس کے مختلف ادوار کی تاریخ بیان کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا۔

اُس ادارے کی تشکیل و ترقی میں جن قدسی نفس بزرگوں نے مختلف ادوار میں حصّہ لیا اُن میں چند ایک ممتاز نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری، شمس العلماء مُفتی مولانا محمد عبداللہ ٹونکی، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ، ڈاکٹر سر مارک آرل اسٹائن، سر ٹامس آرنلڈ، ڈاکٹر اے۔ سی وولنر، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر لکشمن سروپ، مولانا عبدالعزیز میمن، سید اولاد حسین شاداں بلگرامی، حافظ محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، ڈاکٹر بنارسی داس جین، ڈاکٹر سوریا کانت، ڈاکٹر سید عبداللہ، شیخ سر عبدالقادر، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر شیخ عنایت

اللہ، اور پروفیسر وقار عظیم، کالج کی عنانِ انصرام اب ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاتھ میں ہے جو ایک جانے پہچانے محقق، نقاد اور ادیب ہیں۔"

اس خطبے سے اورینٹل کالج کے ساتھ اُن کی گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ اورینٹل کالج کے قدیم و جدید اساتذہ سے کتنی دلچسپی رکھتے تھے۔

اورینٹل کالج ہی پر کیا منحصر ہے، رحمٰن صاحب تو اپنے زمانے میں ہر علمی اور تدریسی ادارے سے اسی طرح اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، مجلس ترقی ادب، بزم اقبالؒ، ادارۂ معارف اسلامیہ اور ایسے ہی نہ جانے کتنے اداروں کے وہ صدر تھے، ان اداروں میں جو علمی کام ہوتا تھا۔ رحمٰن صاحب خود اُس کی نگرانی کرتے تھے اور یہ علم و ادب سے اُن کی گہری وابستگی کی دلیل ہے۔

رحمٰن صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ بے تکلف احباب کی محفلوں میں اُن کی بذلہ سنجی اپنے شباب پر نظر آتی تھی۔ ایسے ایسے واقعات بیان کرتے تھے اور ایسے ایسے لطیفے سُناتے تھے کہ محفلیں زعفران زار بن جاتی تھیں۔ ویسے وہ عام طور پر بظاہر سنجیدہ نظر آتے تھے، اور چھوٹوں کے سامنے وہ صرف کام کی بات کرتے تھے۔ لیکن ہمیشہ شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ خود کام کرنا اور دوسروں سے کام لینا اُنہیں خوب آتا تھا۔ وہ عالم آدمی تھے۔ اسلامی علوم کے وہ ماہر تھے۔ قانون کے معاملات و مسائل پر اُنہیں عبور حاصل تھا۔ ذہانت اُن میں ایسی تھی کہ ایک لمحے میں معاملات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ اُن کا مزاج تجزیاتی تھا، اس لئے وہ صحیح فیصلے کرتے تھے۔ تہذیب و شائستگی ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ نہایت نرم دل تھے، اور کسی کو تکلیف

میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہر شخص کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر نوجوانوں، طالب علموں، ادیبوں، شاعروں اور علمی کام کرنے والوں کے لئے اُن کی شفقت اور محبت بے اندازہ تھی۔ اِن سب لوگوں سے وہ اچھی طرح ملتے تھے، اور اُن کی مدد کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا اُن کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف تھا۔

اپنی منصبی مصروفیات کے باوجود رحمٰن صاحب نے خاصا علمی ادبی کام بھی کیا۔ وہ ایک اعلےٰ درجے کے شاعر اور ادیب تھے، اور اپنا زیادہ وقت علمی ادبی کاموں میں گذارتے تھے۔ انہوں نے غزلیں کہیں، نظمیں لکھیں، اور اردو میں دوسری زبانوں کی شاعری کے ترجمے بھی کئے۔ اُن کے مضامین، خطبات اور مقدمات رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اُن کی غزلوں اور نظموں کا مکمل مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے لیکن ان میں سے بیشتر مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں، اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں شاعری میں وہ روایت پسند ہونے کے باوجود جدت پسند تھے۔ انہیں طرزِ کہن پر اَڑنا نہیں آتا تھا۔ وہ ہر نئی ادبی تحریک اور ہر نئے رُجحان کا خیر مقدم کرتے تھے، اور اُس کے علم برداروں پر اُن کی شفقت اور محبت سایہ کئے رہتی تھی۔ وہ انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو زبانوں پر قُدرت رکھتے تھے، اور ان زبانوں میں ادبی رنگ و آہنگ کے ساتھ اظہارِ خیال کرنا اُنہیں خوب آتا تھا۔ خصوصاً انگریزی اور اُردو میں جب وہ مختلف موضوعات پر لکھتے تھے تو اُن کے اندازِ تحریر میں ایسی روانی، شگفتگی اور شادابی اپنا جلوہ دکھاتی تھی کہ اُن کی تحریروں کو بار بار پڑھنے کی خواہش دل میں انگڑائیاں سی لیتی تھی۔

رحمٰن صاحب ہمیشہ خوش رہتے تھے، اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُنہیں کبھی غصّہ نہیں آتا تھا۔ صرف ایک دفعہ میں نے

اُنہیں غصّے میں دیکھا، اور یہ غصہ انہیں ایک غلط بات پر آیا۔

ہوا یوں کہ میں نے اپنی پرنسپلی کے زمانے میں اورینٹل کالج کے ایک شعبے میں بڑی کوشش سے ایک پروفیسر کی جگہ منظور کروائی۔ ایک شخص نے اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر یونیورسٹی کی ایک کمیٹی میں اس کی مخالفت کی، اور کہا کہ "فی الحال اس پوسٹ کی ضرورت نہیں ہے"۔ یہ بات رحمٰن صاحب کے لئے عجیب وغریب تھی۔ اس لئے انہیں اس بات پر غصّہ آیا۔ اُنہوں نے اس شخص کو آڑے ہاتھوں لیا، اور کہا کہ "زندگی میں پہلی دفعہ آج میں نے ایک پوسٹ کے منظور ہو جانے کے بعد کسی اُستاد کو اُس کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ پوسٹیں اور خصوصاً پروفیسر کی پوسٹیں آسانی سے منظور نہیں ہوتیں۔ یونیورسٹی کے کسی شعبے میں پروفیسر کے تقرر سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ شعبے میں اس سے نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور تدریس و تحقیق کا صحیح ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مخالفت میری سمجھ سے باہر ہے"۔

رحمٰن صاحب کی یہ باتیں سُن کر اور اُنہیں غصّے میں دیکھ کر اس شخص کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، اور وہ خاموش ہو گیا۔ رحمٰن صاحب سے اُس نے معذرت بھی کی، اور اُنہوں نے اُس کو معاف بھی کر دیا لیکن وہ اُس کے اس احمقانہ روّیے کو کبھی بھولے نہیں۔ کئی بار اُنہوں نے مجھ سے افسوس کے ساتھ اِس کا ذکر کیا۔ اس لئے کہ اُس شخص کی یہ مخالفت اکیڈمک اصولوں کے خلاف تھی۔

بات یہ ہے کہ رحمٰن صاحب بُنیادی طور پر اکیڈمک آدمی تھے، اور علم و ادب کی ترقی کے لئے یونیورسٹی میں زیادہ سے زیادہ پروفیسروں کے تقرر کو ضروری سمجھتے تھے۔ اِن معاملات میں اُن کا روّیہ ہمیشہ مثبت ہوتا تھا۔ اس معاملے میں وہ میرے ہم خیال تھے۔ اس لئے جب بھی میری طرف سے اس قسم کی تجویز سامنے آتی تھی تو وہ ہمیشہ اُس کو سراہتے اور اُس

کی تائید کرتے تھے۔ مجھے اُن کی معاونت اور شفقت و محبت کی بدولت اِن خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں مجھے ہمیشہ کامیابی ہوئی۔

پنجاب یونیورسٹی نے اکیڈمک معاملات میں رحمٰن صاحب کی گہری دلچسپی اور علم وادب سے اُن کے شغف کے پیشِ نظر اُنہیں ڈی لٹ اور ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگریاں بھی دیں۔ اورینٹل کالج نے 'نذرِ رحمٰن' کے نام سے تحقیقی اور ادبی مقالات کی ایک ضخیم اور خوبصورت جلد بھی اُن کی خدمت میں پیش کی، اور حکومت پاکستان نے بھی مختلف طریقوں سے اُن کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔

لیکن جو کارنامے اُنہوں نے علم وادب کی دُنیا میں انجام دیئے ہیں اُن کا تقاضا تو یہ ہے کہ اُن کی شخصیت اور شاعری پر باقاعدہ کام کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ کام پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج ہی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اِن اداروں کے بہت بڑے محسن تھے لیکن آج کل ان اداروں کا حال تو یہ ہے کہ؎

فُرصت کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

رحمٰن صاحب اپنے عہد کی ایک اہم تہذیبی اور علمی ادبی شخصیت تھے۔ علم وادب کی دُنیا میں اُن کے کارنامے بے شمار ہیں۔ وہ دانش وروں ادیبوں، عالموں اور پروفیسروں کے مُحسن تھے، قدیم و جدید تہذیبی و ادبی روایات کے حسین امتزاج کے علم بردار تھے۔ وہ ایک اعلےٰ درجے کے شاعر اور ادیب محقق اور نقاد اور اقبالؒ شناس بھی تھے، اور سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شخصیت یہ تھی کہ وہ ایک عظیم انسان تھے ـــــ ایک ایسے عظیم انسان جس کی تلاش و جستجو رحمٰن صاحب کے محبوب اسلامی مُفکرّ شاعر اور انسان دوست فلسفی مولانا رومؒ کی دیرینہ آرزو تھی، اور جس کا اظہار اُنہوں نے حد درجہ جذب و شوق کے ساتھ اپنے اِن اشعار میں کیا تھا؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دو ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہم رہانِ سُست عناصر دلم گرفت
شیرِ خُدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جُستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

ڈاکٹر عبادت بریلوی

کی

کتابیں

اقبالیات

۱۔ جشن نامۂ اقبال (اردو)	شائع کردہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۔ جشن نامۂ اقبال (انگریزی)	" " " "
۳۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (اردو)	" " " "
۴۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (انگریزی)	" " " "
۵۔ اقبال کی اردو نثر	اقبال اکیڈمی، لاہور
۶۔ اقبال ـــــ احوال وافکار	مکتبۂ عالیہ، لاہور
۷۔ جہانِ اقبال (ادبی سوانح) (زیر طبع)	ادارۂ ادب وتنقید، لاہور
۸۔ اقبال کی غزل	" " " " "
۹۔ منظوماتِ اقبال	" " " " "
۱۰۔ اقبال کا فن	" " " " "

ادبی دریافت (نادر قلمی نسخوں کی دریافت اور ترتیب وتدوین)

۱۱۔ شکنتلا، مولفۂ مرزا کاظم علی جوان (مع مقدمہ)	اردو دُنیا، کراچی
۱۲۔ ہفت گلشن، مولفۂ مظہر علی خاں ولا "	" " "

۱۳۔ مادھونل اور کام کندلا، مظہر علی خاں ولاؔ (مع مقدمہ)	اُردو دنیا، کراچی
۱۴۔ دیوانِ ولاؔ " " " "	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۱۵۔ گلزارِ چین مولفہ خلیل علی خاں اشک " " "	"
۱۶۔ رسالۂ کائنات " "	"
۱۷۔ شکوۂ فرنگ مولفہ آغا محو شرف "	"
۱۸۔ چار گلشن، مولفہ بینی نرائن جہاںؔ "	"
۱۹۔ دیوانِ مبتلا، مولفہ عبید اللہ خاں مبتلاؔ "	"
۲۰۔ دیوان حیدری، مولفہ سید حیدر بخش حیدری "	"
۲۱۔ مختصر کہانیاں " "	"
۲۲۔ تذکرہ گلشن ہند " "	"
۲۳۔ گلزار دانش (دفتر اول) " "	"
۲۴۔ گلزار دانش (دفتر دوم) " "	"
۲۵۔ مرقع مخلص، مولفہ آنند رام مخلص (مع مقدمہ و حواشی)	"
۲۶۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں، مولفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ	"
۲۷۔ نقلیات ہندی جلد اول و دوم "	"
۲۸۔ افسانۂ عشق، مولفہ الٰہی بخش شوق اکبر آبادی مع مقدمہ	"
۲۹۔ سیاحت نامہ، مولفہ نواب کریم خاں مع مقدمہ	"
۳۰۔ نالۂ درد، مولفہ حضرت خواجہ میر دردؔ (اُردو ترجمہ مع مقدمہ)	"
۳۱۔ نکات الشعراء، مولفہ میر تقی میرؔ (مع مقدمہ و حواشی	"
۳۲۔ دیوانِ فارسی، مولفہ حضرت خواجہ میر دردؔ "	"
۳۳۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد اول)	"
۳۴۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد دوم)	"
۳۵۔ خطوط عبدالحق بنام عبداللہ چغتائی (مع مقدمہ و حواشی)	"

تحقیق وتنقید

۳۶۔ اُردو تنقید کا ارتقا :	انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی
۳۷۔ روایت کی اہمیت	〃
۳۸۔ غزل اور مطالعۂ غزل	〃
۳۹۔ خطباتِ عبدالحق : مع مقدمہ	〃
۴۰۔ مقدماتِ عبدالحق : مع مقدمہ	اُردو مرکز لاہور
۴۱۔ انتخابِ خطوطِ غالب 〃	〃
۴۲۔ تنقیدی زاویے (پہلا ایڈیشن)	مکتبۂ اُردو لاہور
(دوسرا ایڈیشن)	اُردو مرکز لاہور
۴۳۔ تنقیدی تجربے	اُردو دنیا کراچی
۴۴۔ مومن اور مطالعۂ مومن	〃
۴۵۔ جدید شاعری	〃
۴۶۔ کلیاتِ میر (مع مقدمہ)	〃
۴۷۔ کلیاتِ مومن 〃	〃
۴۸۔ شاعری اور شاعری کی تنقید	〃
۴۹۔ سحرالبیان ـــــ ایک تنقیدی مطالعہ	اورینٹل کالج، لاہور
۵۰۔ غالب اور مطالعۂ غالب	رائٹرز اکیڈمی، لاہور
۵۱۔ غالب کا فن	گلوب پبلشرز، لاہور
۵۲۔ اقبالؒ کی اُردو نثر	اقبال اکیڈمی، لاہور
۵۳۔ اقبالؒ ـــــ احوال وافکار	مکتبۂ عالیہ، لاہور
۵۴۔ میر تقی میر (حیات اور شاعری)	ادارۂ ادب وتنقید، لاہور
۵۵۔ ولی اورنگ آبادی 〃	〃

۵۶- پاکستان کے تہذیبی مسائل	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۵۷- حضرت خواجہ میر دردؔ	//
۵۸- ادب اور ادبی قدریں	//
۵۹- تنقید اور اصول تنقید	//
۶۰- افسانہ اور افسانے کی تنقید	//
۶۱- شاعری کیا ہے؟	//
۶۲- جہانِ میرؔ	//
۶۳- میرؔ کی غزل	//
۶۴- منظوماتِ میرؔ	//
۶۵- نظیرؔ اکبر آبادی	//
۶۶- جدید اُردو ادب	//
۶۷- فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	//
۶۸- میر امّن دہلوی	//
۶۹- سید حیدر بخش حیدری	//
۷۰- ڈاکٹر جان گلکرسٹ	//

رپوتاژ، ڈائری وغیرہ

۷۱- ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک	گلوب پبلشرز، لاہور
۷۲- جشنِ صد سالہ اورینٹل کالج لاہور	اورینٹل کالج، لاہور
۷۳- جشنِ اقبالؔ نئی دہلی	//
۷۴- آزادی کے سائے میں	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۷۵- اورینٹل کالج میں تیس سال زیرِ طبع	//
۷۶- لندن میں پانچ سال //	//

Scanned by CamScanner